اغوا کا راز
www.pdfbooksfree.pk
سید علی رضا
Tabeer Publishers
www.pdfbooksfree.pk

اغوا کا راز
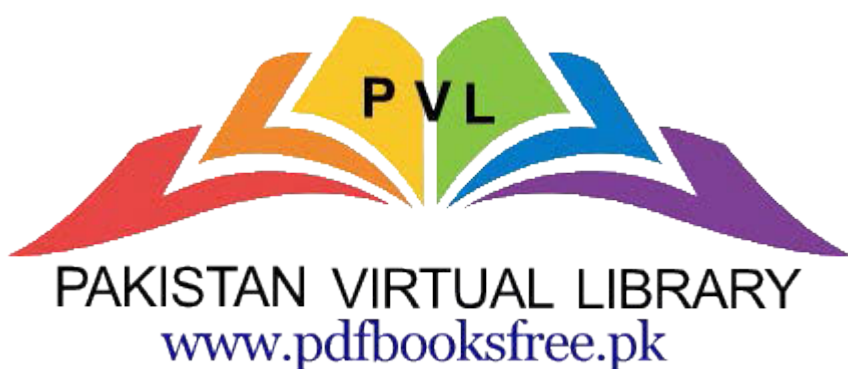
سید علی رضا

تعبیر پبلشرز: B-123، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: 5863408

فہرست

پہلا باب

فرار

''ہاں ہاں......آ جا آ جا......شاب باش......آ آ آ آ آ......یہ لے!'' پھر تیلے دشمن کے قریب آتے ہی ہم نے اپنا باز و گھمایا اور ہاتھ میں پکڑا موٹا گتہ گھما کے دشمن کے ''منحوس منہ'' پہ دے مارا۔ ''اوہ آوہ آوچ'' کی آواز کے ساتھ دشمن چکراتا ہوا نیچے گرا اور جہنم رسید ہوگیا۔ اسی گتے کی مدد سے ہم نے اس مکھی کی لاش کو دیگر 15 لاشوں کے ساتھ ڈالا اور سترھویں مکھی کی تاک میں بیٹھ گئے۔

دراصل ان دنوں آئے دن شدید قسم کی ہڑتالوں کے باعث ہم گھر میں محصور تھے۔ کبھی پہیہ جام تو کبھی کسی سیاسی تنظیم کی ریلی یا پھر کسی حکومتی فیصلے کے خلاف بغاوت۔ ہر بار نتیجہ ایک ہڑتال کی صورت میں نکلتا تھا اور ہڑتال والے دن شہر کا شہر ایسے گھروں میں بند رہتا تھا گویا کرفیو لگا ہے۔ اب ایسے میں ہم مکھیاں نہ مارتے تو کیا کرتے! لیکن سترھویں مکھی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ ہم نے سولہ عدد مری ہوئی مکھیاں ڈسٹ بن میں ڈال کر ٹھکانے لگا دیں۔

''چلو یار شام کا اخبار ہی پڑھ لیں!'' ہم نے انگڑائی لی اور پچھلی شام کا اخبار اٹھا کے نظروں کے سامنے تان لیا۔

''یا اللہ!'' اخبار پہ نظر ڈالتے ہی ہماری نبض ڈوبنے لگی اور ہاتھ کانپنے لگے۔

''فلاں جگہ سے اتنا اسلحہ اور ٹنوں کے حساب سے منشیات برآمد۔ فلاں جگہ دہشت گردی میں فلانے مسلک کے اتنے آدمی مارے گئے۔ فلاں جگہ فلان نے فلاں کو

بے دردی سے قتل کر دیا۔ فلاں جگہ سے فلاں، فلاں کو لے بھاگا۔ فلاں محلے سے فلاں لاش ملی۔ ''اف! اف!'' ہمارا سانس پھولنے لگا اور آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں۔

''امی ی ی'' ہم نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''امی ی ی ی ای ای ..... ! میرا بلڈ پریشر لو کیوں ہو رہا ہے! چک چکر کیوں آ رہے ہیں..... لیموں..... لیموں پانی..... ہاں بھئی..... چل کے لیموں کا پانی پینا چاہیے!'' ہم نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا اور اخبار کو مروڑ کے ڈسٹ بن میں ڈال کے فریج کی طرف چل دیئے۔

''ارے تمہارا رنگ اتنا پھیکا کیوں پڑا ہوا ہے؟'' امی نے تعجب سے پوچھا۔

''کچھ نہیں امی۔ شام کا باتصویر اخبار دیکھ لیا تھا!'' ہم نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ٹھیک اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور امی فون اٹھانے چلی گئیں۔

''کس کا تھا امی؟'' ہم نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''پتا نہیں ..... دو تین بار ہیلو کہا لیکن وہاں سے کوئی بولا ہی نہیں۔'' امی نے باورچی خانے سے جواب دیا۔

''CLI پہ نمبر تو آیا ہی ہوگا!''

''نہیں بھئی! Unknown number تھا!''

''اچھا!'' ہم نے کندھے اچکائے اور وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھنے لگے۔

''ماموں ں ں!'' T.V کی آواز سن کر پڑوس سے ماہ جبین نے نعرہ لگایا۔

''Cable آ گیا کیا؟''

''نہیں آیا ہے! کبھی لوکل چینل بھی دیکھ لیا کرو..... تم لوگوں کا تو Cable کے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا!''

''بھئی ان پہ اچھے پروگرام آتے ہی کہاں ہیں!'' اس نے بے زاری سے کہا۔

ٹی وی پہ اس وقت خبریں آ رہی تھیں۔ ہم نے بے زاری سے T.V بند کر دیا۔

''ایسی خبروں سے تو بے خبر ہی رہنا اچھا!'' ہم بڑبڑائے اور ٹھیک اسی وقت فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

''ٹھہریے امی میں دیکھتا ہوں!'' ہم نے کہا اور فون سننے چل پڑے۔ ''ہیلو!''

جواب میں دوسری طرف خاموشی رہی۔ ''ہیلو'' ہم نے نسبتاً زور سے کہا۔

اب کے دوسری طرف سے کسی کے تیز تیز گہرے گہرے سانس لینے کی آواز آئی۔

''ہائیں لو!'' ہم نے حیران ہو کر کہا۔ پھر وہی گہرے گہرے سانس! تنگ آ کے ہم نے فون کا ریسیور پٹخ دیا۔

''کون تھا؟'' امی نے پوچھا۔

''کوئی دمے کا مریض!'' ہم نے منہ بنایا۔

''دمے کا مریض؟''

''اتنی لمبی لمبی گہری سانسیں لے رہا تھا ..... وہی Unknown Number ہے!'' ہم بے زاری سے بولے۔

''ایک تو یہ ہڑتالیں بھی یار! سارا دن مفلوج گزرتا ہے..... معیشت، تعلیم، کاروبار سب کچھ ٹھپ ..... تباہ! Daily Wedgers والے بے چارے دکان دار ..... ٹھیلے والے یا دوسرے مزدور بھوکے مریں۔ Strike ہونہہ!'' ہمیں شدید غصہ آ رہا تھا۔ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ دوسری طرف وہی استھما کا مریض تھا۔

''تازہ تازہ سانسیں! ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں! مہکی مہکی سانسیں! حکیمی منجن کی بدولت!'' ہم تلملا گئے اور فون پٹخ دیا۔

☆☆☆

حکومت کی جانب سے ہڑتالیوں اور ان کے حامیوں کو پکڑ کے جیل بھیجنے کی دھمکی کارگر رہی اور ہڑتالوں کا سلسلہ تھما اور کاروبار زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگے۔ لیکن وہ

فون آنا بند نہیں ہوئے۔ فون اگر امی یا گھر کا کوئی دوسرا فرد اٹھاتا تو بغیر کچھ کہے یا سانس لیے فون بند کر دیا جاتا...... گہرے گہرے سانس صرف تب ہی لیے جاتے جب فون ہم اٹھاتے۔

"Unknown Number سے آخر مراد کیا ہے؟ کیا کوئی خفیہ نمبر ہے جو ایکسچینج کے رکارڈ میں نہیں ہے؟" ایک دن امی نے الجھ کر پوچھا۔

"Unknown Number دراصل دو طرح کے ہوتے ہیں...... ایک وہ جو بیرونِ ملک سے آتے ہیں...... مثلاً اگر آسٹریلیا سے کوئی فون کرے تو اس کا فون نمبر CLI پر لکھا نہیں آئے گا بلکہ Unknown Number ہی لکھا آئے گا، اسی طرح اگر کسی نان ڈیجیٹل فون سے یعنی ایسے فون سے جس کا نمبر سات کے بجائے چھ ہندسوں پر مشتمل ہو، اس سے کیا جائے تو بھی نمبر کے بجائے Unknown Number لکھا آئے گا!" ہم نے تفصیلی جواب دیا۔

ویسے یہ بات طے ہے کہ یہ فون بیرونِ ملک سے کوئی پاگل بھی نہیں کرے گا، اب اتنا پاگل کون ہوگا جو بیرونِ ملک سے گونگے فون کرے۔ یہ فون اندرونِ ملک اور ممکن ہے اندرونِ شہر ہی سے کیے جا رہے ہوں!" ابا جان نے گویا نتیجہ سا نکالا۔

"تو کیا ان ٹیلی فونوں سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں؟" ہم نے پریشانی سے پوچھا۔ ان ٹیلی فونوں کو تقریباً ایک ماہ ہو چکا تھا اور تمام گھر ذہنی کوفت میں مبتلا تھا۔ کسی شیطان نے ذہنی اذیت دینے کا نیا طریقہ نکالا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا۔

"نہیں! سوائے اس کے کہ ہم اپنا نمبر بدلوا لیں۔" ابا جان بولے۔

"ارے!" وہ اچانک چونکے۔ "قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ صرف تمہارے فون اٹھانے پر ہی گہرے گہرے سانس کیوں لیتا ہے؟ میرے یا تمہاری امی کے اٹھانے پر خاموشی سے فون بند کیوں کر دیتا ہے؟"

ابا جان نے ایک قابلِ غور نکتہ اٹھایا تھا جس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

"پتا نہیں ابا جان!" ہم نے منہ بنایا۔ "میں تو اب جب کسی کو سانس لیتے سنتا ہوں پریشان ہو جاتا ہوں...... رات کو سوتے میں یہ سانس کانوں میں گونجتے رہتے ہیں...... جیسے کوئی آسیب ہو...... یہ شخص سامنے آ جائے تو اس کی ناک ہی کاٹ ڈالوں تاکہ سانس لے ہی نہ سکے!"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے!" ابا جان نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ کوئی تمہارا دوست یا جاننے والا تو نہیں جو شرارت میں تمہیں تنگ کر رہا ہو!"

ابا جان کی بات سن کر ہم سوچ میں پڑ گئے...... پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ناممکن...... اول تو میرا فون نمبر میرے صرف چند جاننے والوں کے پاس ہے۔"

"کسی سے تمہارا جھگڑا ہوا ہو اور وہ بدلے کے طور پر......"

"میں کس سے اور کیوں جھگڑا کرنے لگا؟"

"یہ بات تو طے ہے کہ یہ پراسرار شخص جو بھی ہے، تمہاری آواز اور تمہیں بھی بہت اچھی طرح پہچانتا اور جانتا ہے!" امی کی بات سن کر ہم نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ اس بات سے ہم بہت اچھی طرح متفق تھے۔

"یہ بہت خطرناک بات ہے! پتا نہیں وہ کیا چاہتا ہے!" امی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"چھوڑیئے امی! آپ تو بلاوجہ پریشان ہونے لگیں! یہ کسی کی ایک شرارت ہے اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں!" ہم نے جلدی سے کہا۔

"کوئی شرارت اس قدر طویل نہیں ہوتی...... یہ کوئی اور چکر ہے...... کوئی گہرا چکر!" ابا جان نے عجیب طرح سے کہا اور ہم چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

☆☆☆

اس دن ابا جان گھر آئے تو فکرمند سے تھے۔

"کیا ہوا؟" امی نے پوچھا۔

"انسپکٹر شہباز آج ملے تھے!"

"اچھا!" ہماری دلچسپی یکا یک بڑھ گئی۔

"کوئی اچھی خبر نہیں تھی ان کے پاس!"

"کہہ کیا رہے تھے؟"

"ڈگو جگو اور ان کا تمام گروہ جیل سے فرار ہو گیا ہے!"

"کیا!"

"کب؟" اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے ہم نے پوچھا۔

"ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا!"

"اوہ! تو کہیں یہ پراسرار فون ان ہی کی طرف سے تو نہیں آ رہے؟"

"ہاں! عین ممکن ہے!"

"اچھا! لیکن آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں......!"

"میں سوچ رہا تھا وہ ہمیں تنگ کرنے کی کوشش نہ کریں...... دو بار تمہاری وجہ سے وہ سزا پا چکے ہیں!"

"دیکھا جائے گا! اگر عقل مند ہوئے تو تیسری بار سزا پانا نہیں چاہیں گے!" ہم نے بے فکری سے کہا اور ابا جان خاموش ہو گئے۔

فون اچانک ہی بلبلا اٹھا۔

"ہیلو!" ابا جان نے فون اٹھایا۔

"فون غضنفر کو دو!" دوسری طرف سے ایک کھردری سی آواز ابھری اور ابا جان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"آپ مجھ ہی سے بات کریں...... میں اس کا والد بول رہا ہوں!" ابا جان نے یہ کہتے ہوئے Speaker کا بٹن دبا دیا۔ آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے...... سنو! تم اپنے بیٹے کے بدلے کیا دے سکتے ہو؟" دوسری طرف سے عجیب سا سوال ہوا۔

"کیا مطلب؟ کھل کے بات کرو!" ابا جان تلملا گئے۔

"اگر ہم تمہارے بیٹے کو قبضے میں کر لیں تو تاوان میں کیا دے سکتے ہو؟" کھردری آواز ابھری۔

"کیا بدتمیزی ہے! کون ہو تم؟" ابا جان غصے میں آ گئے۔

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے؟ تمہیں کچھ نہیں دینا پڑے گا.. تاوان تمہارے بیٹے ہی سے وصول کیا جائے گا!"

"مذاق بند کرو!"

"مذاق تو بہت ہو گیا! مذاق ہی مذاق میں تمہارا بیٹا ہمیں چوٹ دے گیا لیکن اب ہر بات سو فی صد سنجیدہ ہو گی.. تمہارے بیٹے کو اغوا کیا جائے گا اور تاوان کے طور پر.. تمہارے بیٹے کی جان!"

"بدتمیز! تم بچ نہیں سکتے! میں تمہیں دیکھ لوں گا!"

"پہلے اپنے بیٹے کو تو جی بھر کے دیکھ لو!" اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

اس فون کال کے بعد کچھ دن تک ہمارا باہر آنا جانا بالکل بند ہو گیا۔ گھر کے دروازے کھڑکیاں ہر وقت اندر سے بند رہتے۔

امی کے کہنے پر ابا جان ہمیں کراچی سے کہیں دور بھیجنے پر راضی ہو گئے تھے اور وہ جگہ تھی ایبٹ آباد!

ایبٹ آباد بڑا ہی خوب صورت اور پرسکون شہر ہے۔ جدھر نظر ڈالو سبزہ ہی سبزہ اور ایسا سبزہ کہ چرنے کا دل چاہے۔ تمام دن ابر آلود موسم اور وقفے وقفے سے ہلکی بارش، دور سینہ تانے کھڑے سبزے سے لدے پہاڑ، فضا میں پودینے کی بھینی بھینی خوشبو جو جگہ جگہ اگا ہوا تھا۔

ڈھائی دن طویل سفر کے نتیجے میں ایک ہفتہ تک ہماری طبیعت خراب رہی اور ہم ایبٹ آباد کا صحیح لطف اٹھا نہ سکے۔ لیکن جیسے ہی ہماری طبیعت ٹھیک ہوئی ہم نے فٹافٹ ادھر ادھر کے پروگرام بنا ڈالے۔ لیڈی برڈ پارک، ٹھنڈیانی اور ایبٹ آباد سے کچھ دور ہرنائی یا ہرنوئی کا پہاڑی دریا۔

''بھئی واہ! کیا نظارہ ہے! سبحان اللہ!'' ہم نے خوش ہو کر کہا۔

ہرنوئی کا پہاڑی دریا بالکل جھیل سیف الملوک کی طرح تین اطراف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا، چوتھی طرف کے پہاڑ دور نظر آ رہے تھے۔ شدید قسم کا ابر آلود موسم، مسلسل ہلکی بارش، مکمل طور پر پرسکون ماحول اور ٹھاٹھیں مارتا شفاف دریا جسے دور پہاڑ پہ سے ایک چھوٹی سی آبشار کے طور پر گرتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبودار ہوا نے جب ہمیں شرارت سے گدگدی کی تو ہمارا دل بھی گدگدا اٹھا۔

''انکل، وہ سامنے جو اونچائی سے بڑی مگر پتلی سے آبشار گر رہی ہے ناں......'' ہم نے انگلی سے اشارہ کیا...... ''ہم وہاں جا رہے ہیں، دیکھیں تو یہ دریا آ کہاں سے رہا ہے!''

''اچھا!'' انکل نے گردن اٹھا کے آبشار دیکھی۔ ''مگر وہ تو خاصی دور ہے اور پھر اس تک تم جاؤ گے کیسے؟ تیر کے؟''

''تیر کے کیوں؟'' ہم نے جلدی سے کہا۔ ''پہاڑوں پہ سے جائیں گے، راستہ یقیناً ہو گا، اور پھر ابھی تو ہم لوگ چھ سات گھنٹے ہیں یہاں۔ ہم ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گے، تب تک آپ لوگ اپنی محفل جمائیں!''

''ٹھیک ہے!'' انہوں نے منظوری دے دی اور ہم اپنے دریافت کے سفر پر نکل پڑے۔

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ راستہ کہاں سے نکالا جائے!'' ہم ذرا دور نکل کر سر کھجانے لگے۔

''ہم م م م! وہ جو لکڑی اور لوہے کا پل بنا نظر آ رہا ہے اگر کسی طرح اس تک پہنچ

جایا جائے تو آبشار تک آسانی پہنچا جا سکتا ہے! ٹھیک!'' ہم نے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس پل تک کون سا راستہ جا رہا ہے؟'' ہم پریشان ہو گئے...... ادھر ادھر نظریں گھمانے کے نتیجے میں بائیں طرف والے پہاڑ پر ایک پہاڑی سڑک بنی دکھائی دی جو گول گول گھومتی ہوئی پہاڑ کو یوں جکڑے تھی جیسے کوئی دیو قامت اژدھا اپنے شکار کے گرد بل ڈال کر اسے بھینچ لیتا ہے۔

''چلو اسی پہ چلیں...... پل تک نہیں تو کہیں نہ کہیں تو پہنچا ہی دے گا...... ویسے بھی نئی منزلیں راستوں میں بھٹکنے کے نتیجے میں ہی دریافت ہوتی ہیں مثلاً امریکا...... اب کولمبس کو یہ پتا تو تھا نہیں کہ اس بحری راستے پر اس سمت میں ریڈ انڈینز کی دریافت امریکا کو وہ دوبارہ دریافت کر کے اپنے سر سہرا بندھوا لے گا!'' ہم بڑبڑاتے ہوئے پہاڑی سڑک پر ہو لیے۔

پہاڑی سڑک یوں بھی پتلی تھی اور پھر اونچائی پر چڑھنا کافی دقت کا کام تھا، سڑک پر چھوٹے چھوٹے کنکر پتھر بھی پڑے تھے جن پر پیر پڑنے کی صورت میں انجام دریا کی تہہ ہو سکتا تھا، چنانچہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا۔

آدھے سے زیادہ کوہ پیمائی کرنے کے بعد ہم کافی اونچائی تک پہنچ گئے تھے لیکن ٹانگیں درد کی شدت سے ٹوٹی جا رہی تھیں۔

''اب یہاں تک کا سفر طے کر لیا ہے تو تھوڑا آگے اور سہی!'' ہم نے گھٹنے دباتے ہوئے کہا اور سڑک کا اگلا موڑ کاٹا ہی تھا کہ ایک ٹرک 120 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے نیچے اترتا آیا اور ہم چیخ مار کر ایک طرف کو ہو گئے۔

ٹرک کی رفتار یوں بھی خاصی تیز تھی اور پھر پہاڑ سے نیچے اترنے کے نتیجے میں وہ کچھ پھسل بھی رہا تھا۔ ہم دیر تک کانپتے رہے کیونکہ اگر ٹرک ہم پہ سے گزرتا تو ہم اسٹکر بن گئے ہوتے یا پھر پھر وہی دریا کی تہہ ہوتی اور ہم۔

''جاہل کہیں کا!'' ہم بڑبڑائے۔

ٹھیک اسی وقت شدید قسم کی گڑگڑاہٹ اٹھی، ہم نے چونک کر اوپر دیکھا، پہاڑ کی چوٹی پہ سے ایک عدد بڑا سا تودہ نیچے کا رخ کر رہا تھا اور اس کی اسپیڈ ٹرک سے بھی دوگنی تھی۔ گڑگڑاہٹ کے ساتھ شور مچاتا ہوا پتھر پہاڑ سے سیدھا دریا کی طرف گیا۔ ہم نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا، دریا سے ڈھیر سارا پانی اچھل کر اوپر آ رہا تھا۔

'اوہ خدایا! جسے تو رکھے اسے کون چکھے!'' ہم نے جھرجھری سی لی۔

واقعی! اگر وہ ٹرک اتنی رفتار سے نہ آیا ہوتا تو ہم ٹھیک اسی جگہ پہنچ چکے ہوتے جہاں سے وہ پتھر ہوتا ہوا گیا تھا۔ پتھر یا تو وہ ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے کر دریا میں ڈبکی مار چکا ہوتا۔ شکر ہے خدایا! ہم نے دوبارہ شکر کیا اور آہستہ آہستہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھنے لگے۔

''آہاہ!'' ہم نے پل پر پہنچ کر ایک چٹخارہ سا لیا۔ ''مزہ آ گیا! کیا Scene ہے!''

پل دو پہاڑوں کے بیچ بنایا گیا تھا۔ عین نیچے ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا اور آبشار اتنی قریب تھی کہ پانی کی چھینٹیں اڑ کر منہ تک پہنچ رہی تھیں۔

''ارے اے ہے ہے ہے!'' پل پہ پہلا قدم رکھتے ہی ہم ڈر گئے۔ پل بری طرح سے لرز اٹھا۔ ''باپ رے باپ! یہ تو جھولنے والا پل ہے!'' ہم نے جھرجھری لی۔

''اب آ ہی گئے ہو میاں تو یہ مہم سر کر کے ہی جاؤ!'' ہم نے اپنی ہمت بندھائی اور ڈرتے ڈرتے پل پر قدم رکھا۔ وہ پھر بری طرح تھرکا لیکن اب کے ہم نے ڈرنے کے بجائے دوسرا قدم بھی بڑھا دیا۔

پل بہت بری طرح Disco کر رہا تھا، ہم نے دونوں ہاتھ دونوں جانب بنی لوہے کی ریلنگ پر رکھ دیے اور آہستہ آہستہ پھدک پھدک کے آگے بڑھنے لگے۔ اگر کوئی اس وقت ہمیں دیکھتا تو سمجھتا کہ ہم چاند پہ چلنے کی مشق کر رہے ہیں۔

پل کے عین بیچ پہنچ کے ہم رک گئے۔ آبشار چہرے کے بالکل سامنے تھی اور

اوپر آ کر ہوا اور ٹھنڈی اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ ہم نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ہمارے انکل بہت ہی چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ عین اسی لمحے ہمارے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

اگر ہم نے لوہے کی ریلنگ نہ پکڑی ہوتی تو لکڑی کے اس تختے کے ساتھ جس پر ہم کھڑے تھے، ہم بھی دریا کی گود میں جا گرتے۔ تختہ پرانا ہونے کے باعث پل کا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور ہم گرتے گرتے بچے تھے۔

''مر گئے! ایک تختہ بیچ سے نکلا ہے اس کا مطلب ہے باقی بھی جائیں گے! اف۔'' ہم نے بے اختیار ہاتھ منہ میں دبا لیا اور جلدی جلدی پھدکتے ہوئے دوسری سمت پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔ اس طرف راستہ نسبتاً آسان تھا، بلکہ سامنے ہی سے ایک چڑھائی سی گھومتی ہوئی آبشار کی طرف جا رہی تھی، ہم بھی اس پر ہو لیے۔

اوپر پہنچ کر تو ہمارا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ دور کہیں کسی پہاڑ سے پانی ایک چشمے کی صورت میں نکل رہا تھا، وہ پانی وہیں جمع ہو کر ایک بڑی جھیل کی صورت اختیار کر گیا تھا اور جھیل آبشار بناتی ہوئی نیچے دریا میں گر رہی تھی۔ ہم نے نیچے جھانک کر دیکھا اور ہمارا سر چکرانے لگا۔ جوش میں آ کے ہم اچھی خاصی اونچائی پر پہنچ چکے تھے کہ نیچے دیکھ کر ہی ہول آتا تھا۔

ہول کھانے کے بجائے ہم نے وہاں بیٹھ کر کچھ دیر ستانے کا فیصلہ کیا اور ایک گول پتھر سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک نظارہ کرنے کے بعد ہم نے جیب سے ماؤتھ آرگن نکالا اور بجانے لگے۔ اچانک ہی پیچھے ایک آہٹ سی ہوئی، ہم نے چونک کے پیچھے دیکھا اور ہماری چیخ نکل گئی۔

''تت... تت... تم یہاں کیسے؟'' ہم نے بمشکل تھوک نگلا۔

''کیوں؟ کیا یہاں تک صرف تم ہی پہنچ سکتے ہو؟'' وہ ہنسا۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں!'' ہم نے جلدی سے کہا اور کنی کترا کے نکلنا چاہا لیکن

اس نے آگے بڑھ کے راستہ روک لیا۔

''جانا چاہتے ہو؟ چلو میں بھیج دوں!'' اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کے راستہ روک لیا اور ہماری طرف بڑھنے لگا۔

''تمہارے ارا...... دے تو ٹھیک ہیں؟'' ہم نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے خراب ہی ہیں!'' وہ سفاکی سے بولا۔

''کیا مطلب!''

''مطلب بہت آسان...... تمہیں یہاں سے ہلکا سا دھکا دوں گا تم نیچے جا گرو گے اور ظاہری بات ہے نیچے جا کے گرے تو بچنا...... مشکل ہی ہے!'' وہ بدتمیزی سے مسکرایا۔

''نن نن نہیں...... دیکھو نیچے بہت...... بہت بڑے بڑے پتھر ہیں ہم ہم ہم میں تو مر جاؤں گا! پلیز ایسا مت کرنا۔'' ہماری گھگھی بندھ گئی۔

''یہی تو ہم سب چاہتے ہیں کہ تم مر جاؤ!''

''نہیں ایں ایں!'' ہم چلائے مگر ہماری آواز پانی کے شور میں دب گئی۔

پیچھے ہٹتے ہٹے ہم عین کنارے پر آ چکے تھے۔ اب ایک قدم بھی پیچھے ہٹانا نقصان دہ تھا۔

''یہ لے بیٹا تو تو جا!'' یہ کہتے ہی اس نے ایک ہاتھ ہماری طرف بڑھایا۔

''نہیں ایں ایں!'' ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر چلائے۔

لیکن تب تک وہ ہمیں نیچے دھکیل چکا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑے ہونے کے باعث وہ بھی ہمارے ساتھ لڑکھڑایا اور ہم دونوں ہی آبشار سے نیچے گر پڑے۔

''آ آ آ آ!'' ہم بری طرح چلائے اور اٹھ بیٹھے۔

ہمارا پورا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ ''شک...... شکر ہے یہ خواب تھا!'' ہم نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا اور روم ریفریجریٹر سے پانی نکال کر پینے لگے۔

اس خواب نے ہماری نیند مکمل طور پر اڑا دی تھی۔

''نہ جانے اب یہ لوگ کیا خطرناک چکر چلا رہے ہوں!'' ہم سوچنے لگے۔

''اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچیں، میں ان تک پہنچ کر انہیں گرفتار کروا دوں گا!'' ہم نے ایک عزم سے فیصلہ کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔

❀❀❀

دوسرا باب

مہم

"اچھا بھئی! خدا حافظ!" ہم نے سامان اٹھاتے ہوئے امی سے کہا۔

"خدا حافظ! خیال رکھنا اپنا۔ وقت پہ کھانا پینا، اپنے میزبانوں کو زیادہ پریشان مت کرنا، اور کہیں اکیلے آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے!" امی نے ایک ہی سانس میں کئی نصیحتیں کر دیں۔

"اچھا!" ہم نے سر ہلایا۔

"دس ہزار میں نے تمہیں ابھی دے دیے ہیں، تمہاری خریداری وغیرہ کے لیے باقی ضرورت پڑے تو بتا دینا۔" ابا جان بولے۔

"جہاں بھی جاؤ بسم اللہ پڑھ کے جانا، ان شاء اللہ بخیریت رہو گے!" امی نے تاکید کی۔

تمام نصیحتیں گرہ میں باندھ کر ہم سامان اٹھائے اپنی مہم پہ چل دیے۔

ابا جان نے ہمارا ریل سے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ایبٹ آباد کے لیے بک کروا دیا تھا، لیکن ہم، ابا جان امی کو بتائے بغیر ایک مشن شروع کر چکے تھے۔ ہماری منزل ایبٹ آباد نہیں کراچی میں ہی تھی اور ہمارا رخ اسٹیشن کی طرف نہیں، بلکہ کہیں اور ہی تھا۔

☆☆☆

یہ اقدام بہت خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہم تن تنہا کبھی باہر نہیں رہے تھے اور پھر اس مہم کا انجام کیا ہونا تھا، ہمیں خود کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ہمیں کبھی بھی کسی بھی قسم

کا کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ جیب میں موجود دس ہزار اور چند سو کب تک چلتے! لیکن اب اوکھلی میں سر کیا پورے ہی گھس گئے تھے تو موسلوں کا کیا ڈر!

ہم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

مجرموں کی دشمنی سے بچنے اور ان کی نظروں سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ حلیہ بدل لینا۔ لیکن ہم اب کوئی باقاعدہ سراغ رساں تو تھے نہیں کہ جس کے پاس میک اپ کا باقاعدہ سامان ہوتا۔ پہلے ہم نے سیدھا نائی کی دکان کا رخ کیا۔

☆☆☆

"آئیں صاحب!" نائی نے کرسی پیش کی اور ہم اسے تختِ طاؤس سمجھ کر براجمان ہو گئے۔

"کیا کروں؟"

"یار داڑھی مونچھیں سب صاف کر دو!"

اور وہ شیونگ کریم سے جھاگ بنانے لگا۔

"کہیں سے آئے ہیں؟' اس نے ہمارا سامان دیکھ کے پوچھا۔

"ہوں، ہاں! ابھی ابھی آیا ہوں!" ہم نے بات بنائی۔

"کہاں سے؟"

"یار! زیادہ بلواؤ گے تو cut نہیں لگ جائے گا؟" ہم نے چڑ کر کہا اور وہ خاموشی سے اپنا کام کرنے لگا۔

☆☆☆

جونہی اس نے تولیے سے شیونگ کریم صاف کر کے آئینے کی طرف اشارہ کیا ہم بھنا اٹھے۔

"یہ کس کو بٹھا رکھا ہے میرے سامنے؟"

"جی! آپ ہی تو ہیں!" وہ پریشان ہو گیا۔

"کیا!" ہم دھک سے رہ گئے۔

"آئینے میں ہمیں ایک عجیب و غریب قسم کا "آدمی" نظر آ رہا تھا، جیسے کسی ابلے ہوئے شلجم کو چھری سے چھیل دیا ہو، ناک اور ہونٹوں کا درمیانی فاصلہ جس پر کبھی مونچھیں ہوا کرتی تھیں اب تقریباً دو فٹ کا لگ رہا تھا اور چہرے پر مسلسل لگنے والی ہوا عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔

ہم کچھ دیر تک ششدر بیٹھے آئینہ تکتے رہے، آخر کار ایک چھوٹی سی آہ بھر کے اٹھے اور "Cash Counter" پہ جا پہنچے۔

"شیو بنائی ہے؟" نائی کے کیشئر نے گویا مذاق اڑایا۔

"نہیں! صابن سے منہ دھویا ہے!" ہم جل گئے۔

"اوہ! میں سمجھا بال جھڑ گئے ہیں!" اس نے جلتی پہ تیل کا کام کیا اور ہم 15 روپے اسے تھما کے باہر جانے لگے۔

"ارے ہاں!" ہمیں اچانک ہی ایک خیال آیا۔

اپنا بیگ کھول کے ہم نے اس میں سے ایک ڈبیا نکالی اور اس میں سے بھورے رنگ کے ڈسپوزیبل کونٹیکٹ لینز نکال کے آنکھوں میں فٹ کر لیے۔ نائی یہ سب بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، ہم اسے نظر انداز کرتے ہوئے آئینے کی طرف چل دیے۔

اور اب جو آئینے میں جھانکا تو ایک بالکل نیا چہرہ ہمارے سامنے تھا۔

☆☆☆

اب ہمارا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ بھورے رنگ کے Contact Lenses لگانے اور Clean Shaven ہو جانے کے بعد ہماری شکل پہ ایک کرختگی سی آ گئی تھی اور ہم اپنی عمر سے کچھ بڑے نظر آ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اب کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہم ہیں، اگر ہمارے گھر والے بھی دیکھتے تو یہی سمجھتے کہ یہ کسی پہاڑی علاقے کا رہائشی ہے۔

اب مزید بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دل ہی دل میں مسکراتے ہم اپنی اگلی منزل کی طرف چلے۔

☆☆☆

سب سے بڑا مسئلہ اب تھا قیام کا۔ گھر ہم جا نہیں سکتے تھے۔ کسی دوست یا رشتہ دار کے یہاں جانا مناسب نہیں تھا کہ اس سے ہماری شہر میں موجودگی خفیہ نہیں رہتی۔ چنانچہ ہم نے کسی ادنیٰ سے درجے کے ہوٹل میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

وہ ایک بہت چھوٹا اور پرانا سا ہوٹل تھا لیکن صاف ستھرا۔ ہال میں رکھی میز کرسیوں پہ کچھ لوگ بیٹھے گپیں اور پنجے لڑا رہے تھے۔ کاؤنٹر پر نیم دراز آدمی اونگھ رہا تھا۔

ہم نے اس کے پاس پہنچ کر کاؤنٹر پر ایک دھپ مارا تو وہ ہڑبڑا اٹھا۔

"ایک کمرہ چاہیے!" ہم نے بارعب آواز میں کہا۔

"سنگل یا ڈبل؟" اس نے دریائی گھوڑے کی طرح منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

"سنگل!" ہم خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولے۔

"ایک دن کا کرایہ یعنی چوبیس گھنٹے کا کرایہ 200 روپے!"

"دو سو! اور کھانا وغیرہ؟"

"صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا اسی میں شامل ہے!"

"اور دوپہر کو؟"

"دوپہر کو کھانا کھانا ہے تو اس کا بل علیحدہ ہوگا!"

اور ہم نے دوپہر کا کھانا نہ ہی کھانے کا فیصلہ کیا۔ پیسے بھی تو بچانے تھے۔ یوں بھی حکماء کا کہنا ہے کہ دوپہر کا کھانا نہ کھانا صحت کے لیے بہتر ہے۔

"ٹھیک ہے، مجھے کمرہ دے دو، پیسے میں اوپر جا کے سامان سے نکال کے دے

دوں گا!'' ہم نے کچھ سوچ کر کہا، اگر دس ہزار کی گڈی اس کے سامنے ہی نکال لیتے تو اس کی نیت خراب ہو سکتی تھی۔

یوں بھی گھر سے الگ انسانوں کے ریلے میں ہمیں ہر معاملے میں احتیاط کرنا تھی۔

''ٹھیک ہے بھئی، یہ رجسٹر میں Entry کر دو!'' اس نے ایک پھٹا ہوا رجسٹر ہماری طرف بڑھایا۔

رجسٹر میں اپنا نام وغیرہ لکھ کے ہم نے اسے واپس کر دیا۔

''ٹھیک ہے، یہ چابی لو، دائیں طرف کی سیڑھیوں سے تیسرے مالے پہ کمرہ نمبر 56۔''

اس کا 56 کہنا ہی تھا کہ ہمارے 56 طبق روشن ہو گئے۔

''چھپن میں نہیں جاؤں گا! کوئی دوسرا دو!'' ہم نے بچوں کی طرح ضد کی۔

''ارے! اچھا، اکتالیس نمبر لے لو، لیکن وہ اس کی کھڑکی...... پتا ہے کہاں کھلتی ہے؟'' وہ شرماتے ہوئے بولا۔

''کہاں؟ کہاں! کھلتی ہے؟'' ہم نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ...... پیچھے ناں...... بھینسوں کا باڑہ ہے!'' اس نے شرماتے ہوئے کہا اور ہماری ناک یہ سن کے ہی سڑ گئی۔

''لاحول ولا قوۃ! کوئی اور؟''

''ایک کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی ہے!''

''کس کی؟''

جواباً اس کے چہرے پہ جو بے ہودہ تاثرات پیدا ہوئے وہ چیخ چیخ کر ''چھپن چھپن'' کی تکرار کر رہے تھے۔

ہم نے چابی اس کے ہاتھ سے چھینی اور کمرہ نمبر چھپن میں آ گئے۔

☆☆☆

کمرہ کیا تھا اچھا خاصا مرغی خانہ تھا، اس کا باتھ روم بلاشبہ اس سے زیادہ اچھی حالت میں تھا۔

کمرے کے بیچوں بیچ بچھی کھٹیا پہ ہم نے اپنا سامان پٹخا اور بیگ میں سے سارے پیسے نکال کے اپنی قمیص کی اندرونی جیب میں ٹھونس لیے اور ہزار کا ایک نوٹ نکال کے دوبارہ کاؤنٹر کا رخ کیا۔

''یہ لو بھئی پانچ دن کا ایڈوانس کرایہ!'' ہم نے ہزار کا نوٹ اسے پکڑایا جسے اس نے کافی جانچ پڑتال کے بعد قبول کیا۔

رجسٹر میں رقم کا اندراج کروانے کے بعد ہم اپنی ٹھوڑی مسلتے باہر آ گئے۔

اب ہمیں تلاش تھی ایک عدد PCO کی جہاں سے اندرونِ ملک کال کی جا سکے اور ایسا PCO قریب ہی میں مل گیا۔

PCO سے ہم نے ایبٹ آباد اپنے انکل کو کال ملوائی، سلسلہ جلد ہی مل گیا۔

''ارے بھئی کیا ریل گاڑی ابھی روانہ نہیں ہوئی؟'' انکل نے ہماری آواز سن کے غالباً گھڑی دیکھ کے کہا۔

''ریل گاڑی تو روانہ ہو چکی انکل، بس میں رہ گیا!'' ہم ہنسے۔

''وہ آپ کو یاد ہے میرے اغوا ہونے کا قصہ......'' انکل کے حیرت کا اظہار کرنے پر ہم نے بتانا شروع کیا۔ ''......بس کچھ ویسا ہی چکر ہے، زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا میں، بس اتنا سمجھ لیں یہاں ایک خفیہ مشن پر ہوں۔ امی ابا کو کچھ نہیں پتا، ان کا فون دو دن آئے تو کہہ دیجیے گا کہ میں باتھ روم میں ہوں یا کوئی اور بہانہ بنا دیجیے گا!''

''لیکن یار تم بہت خطرناک کام کر رہے ہو...... خدانخواستہ کچھ ایسی ویسی بات ہو گئی تو تمہارے والدین مجھے ذمہ دار ٹھہرائیں گے!''

''اُفوہ انکل...... میرے ساتھ اللہ جو ہے!''

''اچھا! ٹھیک ہے کل دوپہر میں تمہاری طرف سے تمہارے گھر تمہاری خیریت

کی اطلاع دے دوں گا!'' وہ ہنسے۔

''صرف کل؟''

''ارے بھئی وقتاً فوقتاً!'' انکل جلدی سے بولے اور ہم نے خدا حافظ کہہ کر مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک آدمی گھبرایا گھبرایا PCO میں آن گھسا۔

''بہت گرمی ہے یار!'' اس نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

اور تب ہم نے بھی پہلی بار گرمی محسوس کی۔

''ہاں! گرمی تو بہت ہے!'' ہم نے سیٹی بجائی۔

وہ آدمی فون اپنے قریب کھسکا کر نمبر ڈائل کرنے لگا جبکہ ہم اپنے بقایا پیسے وصول کرنے وہیں کھڑے رہے۔

''ہیلو!'' ریسور میں سے ایک آواز آئی۔

اور جواباً اس آدمی نے جو حرکت کی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔

☆☆☆

وہی گہرے گہرے سانس سن کے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا، وہ آدمی مسلسل گہرے گہرے سانس لیے جا رہا تھا۔ پسینہ اس کے چہرے پہ یوں بہہ رہا تھا گویا کسی نے بالٹی انڈیل دی ہو۔ دل پہ ہاتھ رکھے وہ نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

''ارے ارے!'' PCO والا گھبرا گیا اور اس آدمی کو اٹھانے لگا۔

''بے چارہ! گرمی بالکل برداشت نہیں کر سکتا، پہلے بھی اس کے ساتھ دو مرتبہ یہ ہو چکا ہے۔''

PCO والے کا یہ فقرہ سن کے ہماری جان میں جان آئی اور اپنے پیسے کاؤنٹر

سے اٹھا کے ہم نے واپس ہوٹل کا رخ کیا۔

☆☆☆

ہوٹل میں جا کے ہم نے ایک عدد کافی کا آرڈر دیا اور ہال میں ایک میز پہ سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

کم و بیش 300 جاسوسی ناول اور سینکڑوں جاسوسی کہانیاں پڑھنے کے باوجود بھی ہمیں اب عملی جاسوسی بالکل نہیں سوجھ رہی تھی، کسی ناول میں آج تک اس قسم کے کیس سے پالا بھی نہیں پڑا تھا۔

کچھ ہی دیر میں کافی آ گئی اور ہم گھونٹ گھونٹ بھرتے ہوئے اگلا قدم سوچتے رہے۔

''یار فرض کرو کہ یہ سب کسی ناول میں شرلاک ہومز کے ساتھ ہو رہا ہے اور وہ اس ہوٹل میں بیٹھ کے کافی کے مزے لے رہا ہے تو وہ کافی پینے کے بعد کہاں اور کیوں جائے گا؟''

ہم نے دل ہی دل میں خود سے ایک سوال کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ہم ہر گھونٹ پر یہ سوال دہراتے رہے تاوقتیکہ کافی ختم ہو گئی۔

''بیرا!'' ہم چلائے اور دوسری میزوں پر بیٹھے لوگ مڑ مڑ کے ہمیں دیکھنے لگے۔

''بیرے!'' ہم دوبارہ چلائے۔

ڈانگری کی قسم کا یونیفارم پہنے ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا۔

''جی آپ نے مجھے بلایا جی؟''

''کافی کا بل؟'' ہم نے جیب ٹٹولتے ہوئے پوچھا کیونکہ یہ کافی ناشتے اور رات کے کھانے کے علاوہ تھی۔ اس لیے اس کا بل تو دینا ہی تھا۔

''چند روپے جی!''

''ہممم! اچھا ایک چائے کا کپ کتنے کا ہے؟''

"پانچ روپے جی!" وہ بولا اور ہمارا سر دل پیٹنے کو چاہا!

ان پندرہ روپوں سے ہم تین کپ چائے پی سکتے تھے اور اپنے پیسے بچا سکتے تھے لیکن اب تو کپ حلق سے نیچے اتر چکا تھا چنانچہ اس حماقت سے سبق سیکھتے ہوئے ہم نے اسے پندرہ روپے پکڑا دیے۔

ویسے پندرہ روپے میں کچھ عقل خرید لینا گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

"میری ٹپ جی!" وہ دھیرے سے بولا۔

"منیجر سے لینا!" ہم نے ٹال دیا اور وہ جانے لگا۔

"ارے ارے سنو!" دفعتاً ہمیں ایک خیال آیا اور وہ رک گیا۔

"کچھ سمجھ بوجھ ہے؟"

اس نے بدھوؤں کی طرح سر ہاں میں ہلا دیا۔

"دیکھو...... فرض کرو تم سینما میں بیٹھے ایک جاسوسی فلم دیکھ رہے ہو...... فلم کا ہیرو کچھ لوگوں کا سراغ لگانا چاہتا ہے...... وہ اپنا حلیہ بدلے ہوئے ہے اور کسی کو اس کے نئے حلیے کے بارے میں کچھ نہیں پتا...... اب ہیرو کو جن لوگوں کا یا جس ولن کا سراغ لگانا ہے اسے اس ولن کے ٹھکانے یا کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں پتا...... سمجھ رہے ہو ناں؟"

اس نے میکانکی انداز میں اپنی گردن ہلائی۔

"ہوں...... تو ہیرو کو ولن کے بارے میں کچھ نہیں پتا لیکن ولن کا پتا لگانا اشد ضروری ہے...... اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہیرو آخر کہاں جائے کیا کرے کس کو کھائے کہ اسے ولن کا فوری پتا چل جائے۔"

ہم نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"دوبارہ پوچھیں جی!" اس نے کان کھجایا اور ہم نے پوری داستان امیر حمزہ دوبارہ بیان کر دی۔

"کہاں جائے کیا کرے جی؟" وہ سوچنے لگا۔

"ہاں ہاں جلدی بتاؤ شاباش......" ہم نے بے صبری سے کہا۔

"او جی......طوم نیں جی!"

اور ہمارا دل چاہا کہ اس کو دیوار میں چنوا دیں، لیکن چونکہ اکبر بادشاہ تھے نہیں، اس لیے اس کو تخلیے میں چھوڑ کر خود ہوٹل سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

وہ سارا دن یونہی بے کار گزر گیا۔

رات کو سونے لیٹے تو مچھروں کی لوریوں سے جلد ہی نیند آ گئی لیکن الٹے سیدھے خواب تنگ کرتے رہے۔

سب سے پہلے ہم نے دیکھا کہ کاؤنٹر پہ بیٹھا آدمی دریائی گھوڑے جتنا بڑا منہ کھول کے سانس اندر کھینچ رہا ہے اور تمام میزیں کرسیاں اور آدمی اڑ اڑ کے اس کے منہ میں گرتے جا رہے ہیں۔

نمبر دو پہ آنے والے خواب میں ہم نے دیکھا کہ ہم کسی الف لیلوی قسم کے شہر میں ہیں جس کے حاکم نے ہمیں کسی جرم کی سزا کے طور پر Clean Shaven کروا کے ایک مریل بھینس کی پشت پہ الٹے رخ بٹھا کے شہر گھمانے کا حکم دیا ہے اور آنے جانے والے لوگ اپنی اپنی داڑھی مونچھیں چھو چھو کے ہماری طرف اشارہ کر کے پیٹ پکڑ پکڑ کے قہقہے لگا رہے ہیں۔

تیسرے خواب میں انکل نے ہماری شکایت ہمارے والدین سے کر دی تھی اور ہمارے والدین الٹا انکل ہی کو مار رہے تھے کہ دوسروں کی شکایتیں کیوں کرتے ہو؟ اور ہم دور کھڑے مسکرا رہے تھے۔

چوتھے خواب میں دیکھا کہ ہم ایک بہت بڑے پانی کے ذخیرے میں تیر رہے ہیں جس کی سطح پہ ہزاروں ہرے ہرے پتے پڑے ہیں اور رات کا وقت ہے، دفعتاً ایک آدمی آتا ہے اور چیخ کے کہتا ہے۔ "ابے او! تیرتا ہی رہے گا یا گٹر صاف بھی کرے گا؟"

اور ان تمام خوابوں میں background کے طور پر ڈانگری والے ویٹر کی "ملوم بھیں جی، ملوم بھیں جی!" مستقل بجے چلی جا رہی ہے۔

☆☆☆

صبح ہماری آنکھ غالباً مرغے کی بانگ دینے سے کھلی۔

یہ مرغے کی بانگ کچھ عجیب وغریب سی نہیں تھی!" ہم نے بستر پہ لیٹے لیٹے غور کیا۔

تھوڑی دیر بعد جب قریب سے بھینس کے ڈکرانے کی آواز آئی تو ہم مرغے سے معذرت کرتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور فوراً قمیص کی جیب ٹٹولی۔

رقم وہاں موجود نہیں تھی۔

"ہائے میں لٹ گیا برباد ہو گیا۔ کنگال ہو گیا، دیوالیہ ہو گیا!" ہم باقاعدہ سر پکڑ کے دہائی دینے لگے۔

اچانک نظر سامنے ٹنگی قمیص پر پڑی اور ہمیں یاد آیا کہ ہم کپڑے بدل کر سوئے تھے۔

اس قمیص کی جیب میں "مبلغ نو ہزار روپے" موجود تھے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے باتھ روم چل دیے۔

☆☆☆

ناشتہ کرنے کے بعد ہم کاؤنٹر پہ پہنچے۔

"سنو یہاں کا فون ڈیجیٹل ہے یا نان ڈیجیٹل؟"

"نان!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"دو! کرنا ہے!" ہم نے بھی اپنے الفاظ مختصر رکھے۔

فون سامنے آتے ہی ہم نے جھٹ گھر کا نمبر ملایا۔

"ہیلو!" دوسری طرف امی تھیں۔

"ہیلو امی! السلام علیکم! میں بول رہا ہوں!"

"وعلیکم السلام! خیریت ہے؟ سفر کیسا رہا؟"

"اچھا رہا! انکل کا فون آیا تھا؟"

"ہاں آیا تھا، کہہ رہے تھے تم آتے ہی سو گئے تھے اس لیے وہ خود فون کر رہے ہیں!"

"جی امی تھکن ہی اتنی ہو گئی تھی سفر میں!" ہم انکل کی بات سن کر مسکرائے۔

کچھ اور باتیں کر لینے کے بعد جب ہمارا دل ہلکا ہوا تو ہم نے فون بند کر دیا۔

ناشتہ کرنے کے دوران ہم نے جو پروگرام بنایا تھا اس کے مطابق ہم پہلے اپنی تمام رقم لے کر بازار نکل گئے...... وہاں سے ایک اچھا سا چھوٹا مگر تیز دھاری چاقو خریدا...... پھر بینک جا کر اپنے اکاؤنٹ میں بقیہ رقم جمع کروائی، لیکن رقم جمع کرانے سے پہلے ہم بنک ہی سے سو سو روپے کے بیس نوٹ لے چکے تھے۔

اب ہماری جیب میں دو ہزار روپے بھی تھے اور باقی رقم بھی محفوظ ہو گئی تھی۔

پروگرام کے مطابق اب ہم نے رخ کیا ایک سائیکل والے کی دکان کا۔

وہاں سے ایک عدد سائیکل کرائے پہ لے کے ہم "ٹورڈی کراچی" پر نکل پڑے۔

☆☆☆

سائیکل کی حالت پطرس بخاری والی سائیکل سے کافی بہتر تھی۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں چند بھینسیں...... پیچھے لگ گئیں۔

آگے آگے ہم تیز تیز پیڈل مارتے ہوئے جا رہے تھے اور پیچھے پیچھے کچھ بھینسیں جاگنگ کرتی ہوئی ہم سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ہانپتے ہانپتے ہمارا برا حال ہو گیا لیکن بھینسوں نے تھکنے کا نام نہ لیا۔

آگے الٹے ہاتھ پر ایک گلی آنے والی تھی، ہم نے جان بوجھ کر سائیکل کی رفتار

ہلکی کر دی، جونہی بھینسیں نزدیک آئیں ہم نے تیزی سے سائیکل گلی میں موڑ دی، بھینسیں آگے نکل گئیں لیکن ہم بدقسمتی سے ایک برقعہ پوش خاتون سے سائیکل سمیت جا ٹکرائے۔ اور وہ ہاتھ میں پکڑے انڈوں سمیت دھپ سے زمین پر گر گئیں اور مزید سونے پہ سہاگہ ان کے انڈوں پر ہماری سائیکل بیٹھ گئی۔ نتیجہ ظاہری بات ہے زردی کی صورت ہی میں نکل سکتا تھا۔

''چشمش! تیرا انڈہ غرق ہو!'' وہ دانت بھینچ کر بولیں۔

''جی انڈہ یا بیڑا؟'' ہم جلدی سے بولے

''بیڑہ غرق ہو......''

''لیکن میں تو سائیکل پہ ہوں!'' ہم نے گھنٹی بجا کر کہا۔

''تیری سائیکل چوری ہو جائے......''

''اررررے! ایسے مت کہیے یہ کرائے کی سائیکل ہے!'' ہم گھبرا گئے۔

''ایک تو سارے 24 انڈے توڑ دیے اوپر سے زبان چلاتا ہے!''

''جی چونکہ زبان اوپر ہے اس لیے اوپر ہی سے چلاؤں گا!'' ہم شرما گئے۔

''محلے میں آپ کو انڈے دے دوں!'' ہم نے اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہا۔

''کیا!'' انہوں نے کچھ اور ہی مطلب لے لیا۔

''میرا مطلب ہے دلا دوں!'' ہم سٹ پٹا گئے اور وہیں سے ان کو 24 عدد انڈے دلا دیے۔

''ہونہہ! اسے کہتے ہیں مفلسی میں آٹا گیلا!'' ہم بڑبڑائے، بلاوجہ ہی پیسے ضائع ہو گئے تھے۔

کافی دیر تک سائیکل چلاتے رہنے کے باعث ہمیں تھکن بھی ہو گئی تھی اور بھوک نے بھی ستانا شروع کر دیا تھا۔

وہیں ایک چھوٹے سے کینٹین نما ہوٹل پہ سائیکل روک کر ہم نے ایک عدد کولڈ

ڈرنک اور ایک پلیٹ چٹ پٹی چاٹ کا آرڈر دیا اور بل چکانے کے بعد ہم سائیکل لوٹا کر ہوٹل چلے آئے۔

اگلے دو دن یونہی بے کار گزر گئے۔ جگہ جگہ سائیکل پر آوارہ گردی کرنے کے باعث ہمارا رنگ جل گیا تھا اور بھوک بڑھ گئی تھی لیکن دشمنوں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

صبح ناشتہ کر کے ہم کرائے کی سائیکل پر نکل پڑتے اور شام تک جہاں جہاں جا سکتے تھے، جاتے لیکن اس سے سوائے تھکن کے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس بات کا بھی ڈر تھا کہ پانچ دن بعد دوبارہ ہوٹل کا کرایہ دینا پڑے گا اور پھر دیگر خرچوں میں بھی پیسے خرچ ہوتے تھے، کہیں رقم ختم ہی نہ ہو جائے!

پانچویں دن جب آوارہ گردی کر کے ہم واپس ہوٹل جا رہے تھے کہ ایک جگہ لوگوں کا ہجوم کھڑا دیکھا، بیچ میں ایک آدمی کھڑا کچھ پمفلٹس لوگوں میں تقسیم کر رہا تھا۔

''یہ کیا کوئی سرکس لگا ہے یا کوئی نیا میلہ لگنے والا ہے! دیکھیں تو!''

ہم بڑبڑائے اور قریب جا کر ایک پمفلٹ اچک لیا۔

پمفلٹ میں پاکستان کے حالات یعنی سیاست، دہشت گردی، اخلاقی جرائم وغیرہ کے بارے میں درج تھا ..... یہ اصل میں ایک تنظیم کے بارے میں تھا، کہ ہماری تنظیم اس کے خلاف قدم اٹھا رہی ہے ہم اپنی تنظیم کے ذریعے لوگوں میں شعور اجاگر کرتے ہیں، انہیں صحیح راستہ دکھاتے ہیں، انہیں اچھا شہری بنانے میں مدد دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے دلچسپ فقرہ تھا:

''دہشت گردوں کے اس دور میں انسانی جان کی حفاظت نہ ہونے کے برابر ہے، لوگ گھروں سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں، لیکن آپ اس ڈر کو مار ڈالیے، ہماری تنظیم میں شمولیت حاصل کر کے دفاع کرنا سیکھیے، اپنی جان کی خود حفاظت کیجیے۔ رابطہ ..... ''

آگے ایک پتا درج تھا۔ پمفلٹ پڑھ کے ہم نے سر اٹھایا تو وہ آدمی جا چکا تھا۔

پمفلٹ موڑ کے ہم نے جیب میں رکھا اور ہوٹل آ گئے۔

☆☆☆

وہ رات بس آنکھوں ہی میں کٹی۔ نجانے کیوں وہ پمفلٹ ہمیں رہ رہ کے ستا رہا تھا۔ خصوصاً جب سے یہ جملہ کہ ''15 سے 22 سال کے نوجوانوں کی تنظیم میں 80 فیصد رکنیت رکھی جائے گی۔'' ہماری چھٹی حس رہ رہ کے پھڑک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، صبح ہوتے ہی میں بھی وہاں جاؤں گا!'' ہم نے فیصلہ کر لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔

☆☆☆

پمفلٹ پہ ملاقات کا وقت صبح گیارہ بجے سے لکھا تھا۔ ہم تقریباً ساڑھے گیارہ تک مطلوبہ پتے پر پہنچ گئے۔

وہ ایک بڑی سی عمارت تھی ...... عمارت کیا ایک دو منزلہ بنگلہ تھا جس کو دفتر کی شکل دے دی گئی تھی ...... مین گیٹ پر ایک پلا پلایا بھینسے نما خونخوار صورت چوکیدار بیٹھا تھا لیکن ہم اسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے اندر گھس گئے۔

دائیں ہاتھ ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی جس پر ''معلومات'' کا بورڈ نصب تھا، ہم نے وہیں کا رخ کیا۔

''جی فرمایئے How can I help you'' وہاں بیٹھی لڑکی نے شائستگی سے پوچھا۔

''میں وہ پمفلٹ ...... بٹ رہے تھے ناں کل ...... سڑک پہ!'' ہم بری طرح گھبرا گئے۔

''جی جی!''

''اہم!'' ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ''بات اصل میں یہ ہے کہ میں آپ کی تنظیم کی رکنیت چاہتا ہوں۔''

''یہ فارم بھر دیجئے!'' اس نے ایک عدد زرد رنگ کا کاغذ ہماری طرف بڑھایا، تب ہم نے نوٹ کیا کہ وہاں موجود جس بھی چیز پر رنگ ہو سکتا تھا، زرد رنگ ہوا ہوا تھا۔ پورے دفتر میں زرد رنگ تھا، گیٹ زرد رنگ کا تھا، دروازے کے ساتھ بنی کیاری میں گیندے کے پھول سے تھے، اور تو اور اس لڑکی نے بھی زرد رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

''زرد رنگ آج کل فیشن میں ہے کیا؟'' ہم نے بے خوف ہو کر پوچھا۔

''جی نہیں! اصل میں ...... '' وہ مسکرائی۔ ''...... یہ رنگ ہماری تنظیم کا رنگ ہے ...... اور پھر ہمارے مالک کو بھی یہ رنگ بہت پسند ہے!''

''Oh I see! بہر حال ...... پین بھی دے دیجئے!'' ہم نے کندھے اچکائے اور اس نے ہمیں زرد رنگ کا قلم پکڑا دیا۔

''مکمل نام!'' ہم چکرا گئے۔

''نقلی لکھ دوں بعد میں دیکھا جائے گا!'' ہم نے دل ہی دل میں کہا اور فارم بھرنے لگے۔ یہی شکر تھا کہ قلم سے نیلی ہی روشنائی نکل رہی تھی۔

فرضی نام سے فارم بھر کے ہم نے اس کے حوالے کر دیا۔

فارم کا جائزہ لے کر اس نے اسے ایک فائل میں لگایا اور ہمیں گول رنگ کا ایک زرد ٹوکن پکڑا دیا جس پر گہرے زرد رنگ سے 256 درج تھا۔ چھپن دیکھ کر ہم کچھ چڑ سے گئے۔

''تو گویا آپ کے پاس اب تک 255 افراد آ چکے ہیں!'' ہم نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''جی! آج کی تاریخ میں!'' وہ مسکرائی۔ ''ویسے ہمارے پاس اب تک 850 حضرات رجسٹرڈ ہو چکے ہیں!''

''اوہ! تو یہ تنظیم کتنے عرصے سے چل رہی ہے؟'' ہم حیران ہو گئے۔

''یہی کوئی ...... دس بارہ دن ہو گئے!''

"صرف اسی شہر میں یا......"

"تمام صوبائی دارالحکومتوں میں......دیگر شہروں میں جلد شروع کرنے کا ارادہ ہے!"

"ہم مم! میں کہاں جاؤں؟"

"دائیں ہاتھ سیدھا جائیے...... بائیں ہاتھ پر گلی میں مڑ جائیے...... سامنے ہی لان ہوگا...... وہاں یہ ٹوکن دکھا کر چلے جائیے گا!" اس نے ہاتھ سے اشارے کرتے ہوئے کہا اور ہمارے قدم اٹھنے لگے۔

❁❁❁

تیسرا باب

ایک پستول اور!

"دھک دھک دھک...... دھک دھک!" ہمارا دل پسلیاں توڑ کے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔

"جہاں بھی جاؤ بسم اللہ پڑھ کے جانا، ان شاءاللہ بخیریت رہو گے!" گلی میں مڑتے ہی امی کی نصیحت ہمارے کانوں میں گونجی اور ہم نے جھٹ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لیا۔

گلی ختم ہوتے ہی ہمارے سامنے ایک وسیع و عریض لان آ گیا جس میں پیلی کرسیاں بچھی تھیں۔ جن پر 255 نوجوان بیٹھے تھے۔

لان کے دروازے پر جب ایک اور بھیلیے نے ہمارا راستہ روکا تو ہم نے اسے ٹوکن دکھا دیا اور وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

اندر بچھی کرسیوں میں سے ایک مناسب کرسی دیکھ کر ہم بیٹھ گئے۔ سامنے بنا اسٹیج یہاں سے صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

"کیوں بھائی صاحب، یہ اسٹیج کس لیے؟" ہم نے اپنے پڑوسی سے پوچھا جو ہمارا ہی ہم عمر نظر آتا تھا۔

"پتا نہیں! سنا ہے ابھی کوئی تعارفی تقریر وغیرہ ہے!"

"ہم مم م!" ہم نے ہنکارا بھرا اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگے۔

لان میں بیٹھے افراد کی بلاشبہ 90% تعداد نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ وہ سب

میٹرک یا انٹر کے طالب علم ہوں گے۔ کچھ لڑکے کالج یونی فارم بھی پہنے ہوئے تھے۔ اب پتا نہیں کالج سے بھاگ کے آئے تھے یا ...!

بارہ بجے تک وہاں بیٹھے ہم یونہی جھک مارتے رہے۔

ٹھیک بارہ بجے ایک لمبا تڑنگا آدمی اسٹیج پر آیا اور لان میں مسلسل جاری سرگوشیوں سے پیدا ہونے والی مکھیوں سی بھنبھناہٹ رک گئی۔

''اس آدمی نے آکر دو تین پھونکیں مائیک میں مار کر مائک اور لاؤڈ اسپیکرز چیک کئے اور انہیں صحیح پا کر بولنا شروع ہوا:

وہ ایک کافی لمبی تقریر تھی، کچھ اس قسم کی:

''ساتھیو..... آپ سب یہاں جو جمع ہوئے ہیں اس سے آپ کی ہماری تنظیم میں دلچسپی اور اس نظام سے بے زاری صاف ظاہر ہے، یہ یقیناً آپ کے باشعور اور سمجھدار ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ دوستو یہ تنظیم شروع کرنے کا بنیادی مقصد ملک کی مظلوم عوام خصوصاً نوجوانوں میں شعور اجاگر کرنا ہے ان کے مستقبل کے بارے میں، ان کی منزل کے بارے میں، ان کے معیار زندگی کے بارے میں۔ یہ بات تو آپ سب جانتے ہی ہیں کہ ملک کئی دہائیوں سے مختلف قسم کی زیادتیوں کا شکار رہا ہے، یعنی آپ لوگ ناانصافیوں کا شکار رہے ہیں۔ بے روزگاری، انسانی حقوق کی پامالی، انصاف کے نام پر ناانصافی، رشوت خوری، اقربا پروری، لوٹ مار، مہنگائی جیسے عظیم الجثہ اژدھے آپ لوگوں کو عرصے سے جکڑے ہیں۔ بنیادی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں، لوگوں کا جینا حرام ہے، انہیں سانس لینے کی آزادی نہیں۔ اوپر سے مذہبی و لسانی فسادات آئے دن کا جھگڑا ہیں۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ دوسرے طبقے اور فرقے کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ دہشت گردی۔ آج ایک چوہے کی جان عام شہری سے زیادہ محفوظ ہے۔ لوگ رات کو باہر جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ پتا نہیں کب انہیں لوٹ لیا جائے یا پھر گولی مار دی جائے۔ یہ خوف دن میں بھی سائے کی طرح ساتھ چپکا رہتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ ملک

ہر لحاظ سے ایک جہنم بن کے رہ گیا ہے، لوگ اس ملک کو چھوڑ کر باہر کا رخ کر رہے ہیں لیکن ایسے میں بھی ہماری بیشتر عوام بھولی بھالی ہے، خصوصاً نوجوان طبقہ، جو اس فرسودہ نظام سے فرسٹریشن کا شکار ہے۔ اس تنظیم کا مقصد ایسے ہی بھولے افراد کو عقل دلانا ہے۔ ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانے والا بھی ظالم ہوتا ہے۔ ظلم سہنا بند کیجئے، احتجاج شروع کیجئے اپنے بنیادی حقوق کی مانگ شروع کیجئے۔ اس ملک کے شہری ہونے کے ناتے یہ آپ کا حق ہے!''

اور بھی ڈھیر ساری ایسی ہی باتیں کرنے کے بعد اس نے آخر میں کہا:

''ساری باتیں میں نے آپ سے کرلیں۔ اب یہ بتاتا چلوں کہ تنظیم نے ذاتی دفاع کی بنیاد پر دہشت گردوں سے بچاؤ کے لیے ایک ٹریننگ کیمپ بھی جاری کیا ہوا ہے، یہاں آپ کو جوڈو کرانے، کنگ فو، نشانے بازی، پستول چلانا، غرض ہر ممکن دفاعی گر سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شعوری کلاسیں بھی منعقد کروائی جاتی ہیں۔ جس جس کو ہماری تنظیم میں شمولیت میں دلچسپی ہو وہ کل صبح 11 بجے اپنے ٹوکن کے ساتھ یہاں آ جائے۔ باقی افراد جو اس میں دلچسپی نہیں رکھتے، وہ اپنے اپنے ٹوکن اسی کاؤنٹر پر جمع کرا کے چلے جائیں۔ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ یاد رکھئے! کل گیارہ بجے اور تنظیم میں شمولیت کی کسی قسم کی کوئی فیس نہیں ہے!''

یہ کہہ کر وہ نیچے اتر کر اندر گم ہوگیا اور باقی سب کرسیوں سے اٹھ کر واپس جانے لگے۔

کاؤنٹر کے پاس سے جاتے ہوئے ہم نے دیکھا۔ کئی لوگ ٹوکن واپس جمع کرا رہے تھے۔ ہم نے ایک لمحے کو رک کر سوچا۔ پھر ٹوکن جیب میں ڈال کر واپس ہوٹل چلے آئے۔

☆☆☆

اس دن ہم نے سائیکل والا پروگرام ترک کیا اور سارا دن کمرہ نمبر چھپن میں

بیٹھے اس تنظیم کے بارے میں سوچتے رہے۔ گھر سے نکلے تو کسی اور چکر میں تھے لیکن اب دوسرے ہی چکر میں پھنستے نظر آ رہے تھے...... اوپر سے ہوٹل میں رہ رہ کر ہم اکتا سے گئے تھے، ہم نے فیصلہ کیا کہ تنظیم میں شمولیت حاصل کر کے ان کے اصل مقصد کا پتا کر کے ہی رہیں گے اور تین چار دن مزید ہوٹل میں گزارنے کے بعد سامان سمیت گھر واپس چلے جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ایبٹ آباد میں دل نہیں لگا اس لیے اچانک واپس چلے آئے۔

☆☆☆

اگلے دن گیارہ بجے بمعہ ٹوکن ہم وہاں پہنچ گئے...... کاؤنٹر پر ایک لمبی قطار تھی جو لمبی ہوتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ہم بھی جھٹ لائن میں لگ گئے۔

خدا خدا کر کے جب 70 منٹ بعد ہماری باری آئی تو اسی لڑکی نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور ہم نے اسے جلدی سے ٹوکن تھما دیا۔

وہ ٹوکن الگ رکھ کر ایک رجسٹر میں کچھ درج کرنے لگی۔ ہم نے دیکھا ہمارا یعنی عمران بیگ کا اندراج 1092 پر ہوا تھا۔ گویا ایک ہزار اکیانوے افراد رجسٹرڈ ہو چکے تھے۔

رجسٹر میں اندارج کرنے کے بعد وہ لڑکی ایک کارڈ پر جو کہ شناختی کارڈ جیسا تھا اور حسب توقع زرد تھا، ہمارا نام، عمر اور نمبر شمار 1092 لکھ کر ہمیں ایک عدد زرد سادہ گول بیج تھما کر بولی۔

''کل آپ اپنی دو تصویریں لے آیئے گا آپ کے کارڈ کے لیے چاہیں ہوں گی۔''

''اور یہ بیج!''

''یہ آپ کو اپنی جیب پر لگانا ہوگا تا کہ آپ تنظیم کے باقاعدہ ممبر لگیں۔''

''اب کہاں جاؤں؟''

''یہ ٹائم ٹیبل لے لیں۔'' اس نے ہمیں ایک کاغذ تھما دیا۔

''ہمارے پاس تین سیشن ہیں۔ ہر Session تین گھنٹے پر مشتمل ہوتا ہے۔ صبح کا سیشن آٹھ سے گیارہ، دوپہر کا سیشن بارہ سے تین اور شام کا سیشن تین سے چھ ہوتا ہے۔ ہر سیشن میں پہلے گھنٹے میں شعوری کلاس ہوتی ہے اور دوسرے دو گھنٹوں میں ٹریننگ۔''

''میں شام کا سیشن جوائن کروں گا!'' ہم کچھ سوچ کر بولے۔

''تو پھر آپ ابھی گھر جائیں۔ شام کو اپنی تصاویر لے کر آیئے گا میں آپ کا شناختی کارڈ بنا دوں گی!'' وہ بولی اور ہم سر کھجاتے ہوٹل چلے آئے۔

☆☆☆

''نام عمران بیگ، عمر 17 سال، نمبر شمار 1092۔ سیشن ایوننگ! بھئی واہ!'' ہم اپنا شناختی کارڈ پڑھتے ہوئے ہنسے۔ کاؤنٹر والی لڑکی نے تصویر لگا کر مہر ثبت کی تھی اور وہیں سے پلاسٹک کوٹنگ کر کے ہمیں کارڈ تھما دیا تھا۔

''چلو بھئی میاں عمران بیگ...... کلاس لینے!'' ہم ہنسے اور بتائی گئی کلاس کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

کلاس میں داخل ہو کر ہم ایک کرسی پر براجمان ہو گئے۔ اندر تقریباً 100 لڑکے موجود ہوں گے، کلاس خاصی بڑی تھی اور ابھی تقریباً اتنے ہی لڑکے اور آ سکتے تھے۔ سب نے پیلا بیج اپنی جیب پر لگایا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد وہی آدمی اندر داخل ہوا اور سب کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں ہم پر اٹک گئیں۔

''آپ نے بیج نہیں لگایا؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''میں لگاؤں گا بھی نہیں!''

''کیوں؟''

''بچپن میں ایک بار میں Class Monitor بنا تھا ۔ اسکول جاتے ہوئے Monitor کا بیج لگا رہا تھا کہ پن کھال میں گھس گئی اور اتنا خون نکلا اتنا خون نکلا کہ کمزوری آج بھی محسوس ہوتی ہے!''ہم نے بھولے بن کر کہا اور دیگر ممبر ہنسنے لگے۔

''اب کوئی بھی بیج لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ زیادہ گہرائی میں دل تک نہ پہنچ جائے!''ہم مسکرائے۔

''ویسے آپ میرا کارڈ ملاحظہ کر سکتے ہیں!''ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''اس کی ضرورت نہیں، لیکن بیج کی جگہ آپ کو کارڈ اپنی جیب پر لگانا پڑے گا۔''
اس نے خشک لہجے میں کہا اور ہم نے گردن مٹکا دی۔

عمران بیگ کے روپ میں کلاسیں اور ٹریننگ لیتے ہوئے ہمیں تقریباً دس دن ہو ہی گئے تھے۔ ہر شعوری کلاس میں ملکی حالت اور مسائل پر ایک انتہائی منفی انداز میں لیکچر دیا جاتا جس سے کسی قسم کا شعور اجاگر ہونے کے بجائے غم و غصہ اور منفی انداز فکر طبیعت میں جگہ کر لیتا۔ خصوصاً ٹریننگ میں جس شد و مد سے ہر ہر چیز پر توجہ دی جاتی اس سے یوں لگتا کہ ہم لوگ دفاعی ٹریننگ کے بجائے فوجی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں تنظیم کے اراکین کی تعداد دو ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔

اور دوسری طرف پرانے دشمنوں کا ابھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

ایک دن ہم نے بھنا کر اپنا سامان باندھا، کمرے کی چابی کاؤنٹر پر پٹخی اور گھر کا رُخ کیا۔

☆☆☆

''ہائیں تم! خیریت تو ہے؟''امی کے چہرے پر ہمیں دیکھتے ہی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''جی امی! بس وہاں دل نہیں لگ رہا تھا اس لیے واپس آ گئے!''

''بتا تو دیا ہوتا!''

''بتا دیا ہوتا تو آپ لوگ سختی سے واپس آنے سے منع کر دیتے ......اور ہم وہاں مزید رکنا نہیں چاہتے تھے!''

''تیرا تو رنگ کالا ہو گیا! ایسے مقامات پہ جا کے تو لوگ لال گلابی ہو جاتے ہیں!''امی نے افسوس ناک انداز میں کہا۔

''وہاں پہ اصل میں سائیکل بہت چلائی ہے!''ہم ہنسے۔

''اب ایسی بھی کیا 24 گھنٹے چلائی ہے؟ ویسے بھی وہاں اتنی تیز دھوپ تو ہوئی بھی نہیں!''

''چھوڑیئے بھی اب امی! ہو گیا تو بس ہو گیا! ویسے بھی میں کون سا لڑکی ہوں جو رنگ کالا ہونے کی وجہ سے کنواری ہی رہ جائے گی!''ہم ہنسے۔

''خیر اب گھر سے زیادہ باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک ان مجرموں کا سراغ نہیں لگ جاتا!''امی نے حکم سنا دیا اور ہم نے اس وقت بہتر جان کر تعمیلاً سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اس دن ہم نے تنظیم سے چھٹی کی اور گھر بیٹھ کر مزے سے T.V پر شارجہ کپ کا میچ پاکستان بمقابلہ انڈیا دیکھا۔ سعید انور کی شاندار 150 رنز کی اننگز اور وسیم اکرم کی عمدہ نپی تلی باؤلنگ دیکھ کر پچھلے دنوں کی تکان دور ہو گئی تھی۔

اگلے دو دن بھی ہم امی کو مطمئن رکھنے کے باعث تنظیم کی کلاس لینے نہیں گئے۔

لیکن تیسرے دن ہم امی سے ایک نئے کمپیوٹر کورس کا بہانہ کر کے تنظیم کے دفتر جا پہنچے۔

دن گزرتے رہے، تنظیم میں شمولیت حاصل کیے ہمیں تقریباً ایک ماہ ہو چلا تھا لیکن اب تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جس سے انہیں مشکوک سمجھا جا سکتا، نہ ہی

پرانے دشمنوں کا کچھ پتا تھا، ہاں البتہ وہ پراسرار ٹیلی فون آنا ضرور بند ہو گئے تھے۔

لیکن دفاعی ٹریننگ لیتے لیتے ہم نشانے بازی اور کنگ فو میں خاصے طاق ہو گئے تھے۔

☆☆☆

شام ساڑھے پانچ بجے تھے۔ ٹریننگ کیمپ میں خنجر زنی کی مشق کرتے کرتے اچانک ہی ہمارے ہاتھ میں زخم آ گیا، زخم ذرا گہرا تھا اس لیے خون بھی زیادہ رس رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم اپنے انسٹرکٹر سے اجازت لے کر پچھلی طرف بنے ایک فرسٹ ایڈ کلینک جو شاید اسی احتیاطی تدبیر کے طور پر بنوایا گیا تھا، جا پہنچے۔

ڈاکٹر ایک الماری کھولے کچھ کر رہا تھا۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر وہ کچھ چونک سا گیا اور بوکھلا کر الماری بند کر دی۔

''جی؟ فرمایئے!'' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''یہ زخم آ گیا ہے! چاقو پھینکتے وقت ہاتھ کٹ گیا!'' ہم نے اسے زخم دکھایا۔

''اوہ! آیئے میں پٹی کر دوں۔'' اس نے فرسٹ ایڈ بکس اٹھاتے ہوئے کہا اور ہم وہاں رکھے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

''کافی گہرا زخم ہے!'' وہ بلاوجہ بولا۔ شاید اپنی بوکھلاہٹ چھپانے کے لیے جو اس کی ہر ہر حرکت سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''نام کیا ہے آپ کا؟'' اس نے پوچھا۔

''عمران بیگ! اور آپ کا؟''

''بھیم شاہ!'' اس نے نام بتایا اور ہم چونک سے گئے۔

اس نے ہمارا چونکنا محسوس کر لیا تھا۔ اسی لیے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد خود ہی بولا۔

"I'm not a Muslim."

"It's O.K!" ہم نے کندھے اچکائے۔

پٹی کروا کے ہم باہر تو آ گئے لیکن ڈاکٹر بھیم شاہ کی گھبراہٹ ہماری چاپ سن کے جلدی سے الماری بند کر دینا۔ ہمارے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ ہم نے گھڑی دیکھی، پونے چھ ہو رہے تھے۔ کلاس ختم ہونے میں مزید پندرہ منٹ باقی تھے اس لیے واپس جانا اتنا ضروری نہیں تھا۔ یوں بھی ہاتھ پر پٹی بندھی ہونے کے باعث ہم اب صحیح طرح خنجر زنی کر بھی نہیں سکتے تھے۔

ہم نے وہیں کھڑے رہ کر بھیم شاہ کی جاسوسی کا فیصلہ کیا اور Clinic کے قریب ایک اندھیرے کونے میں چھپ کے کھڑے ہو گئے اور کلینک کی دیوار سے کان لگا دیے۔

اندر بھیم شاہ کی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔

ہم نے بمشکل اپنے کان کھڑے کر کے بغور سنا، وہ کہہ رہا تھا۔

''معاف کرنا یار، ایک لڑکا پٹی کروانے آ گیا تھا اس لیے سلسلہ ختم کرنا پڑا، تم بتاؤ وہ چھ گھوڑے وہاں پہنچ گئے ہوں گے، یہاں رکھنا انہیں خطرے سے خالی نہیں تھا وہ پہچانے جا سکتے تھے..... اس کی کھوج چل رہی ہے..... اوپر اطلاع پہنچا دو کہ ہمارا منصوبہ کامیاب جا رہا ہے..... جلد ہی ہم کونے کونے میں پہنچ جائیں گے..... اور سنو..... اگر کوئی نئے Order ہوں تو ضرور بتانا!''

اتنا کہہ کے وہ چپ ہو گیا اور ہم کھڑے سر کھجاتے رہے۔

بھیم شاہ کی گفتگو کا لفظ لفظ مشکوک تھا۔ منصوبہ..... چھ گھوڑے..... وغیرہ وغیرہ۔

''یہ چھ گھوڑے کیا بلا ہیں؟ کون ہو سکتے ہیں!'' ہم نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔

''ارے! کہیں یہ ڈوگو جکو وغیرہ کی بات تو نہیں ہو رہی!'' ہم اچھل پڑے۔

تعداد میں وہ بھی چھ تھے اور چھ کے چھ ہی جیل سے فرار ہوئے تھے۔ لیکن اگر بھیم شاہ کا اشارہ ان ہی کی طرف تھا تو اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ خود فرار نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں فرار کروایا گیا تھا اور اگر یہ بات تھی تو یقیناً وہ منصوبہ بہت خطرناک رہا ہوگا۔

''آخر اس ڈاکٹر کے بچے سے تفصیلات کیسے معلوم کی جائیں!'' ہم بڑبڑائے اچانک ہی ایک آئیڈیا ہمارے دماغ میں آیا اور کچھ دیر بعد ہم دوبارہ کلینک میں داخل ہو رہے تھے۔

☆☆☆

''آپ!'' وہ پھر چونک گیا۔

''ڈاکٹر... یہ پٹی کھل گئی ہے!'' ہم نے کراہتے ہوئے کہا۔

پٹی ہم باہر کھڑے ہو کر ڈھیلی کر چکے تھے۔

''اوہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے تو بہت اچھی طرح پٹی کی تھی، بہر حال آیئے میں دیکھتا ہوں!'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

جوں ہی وہ قریب آ کر ہمارے ہاتھ پر جھکا، ہم نے پھرتی سے جھپٹ کر اس کا گلا اپنے بازو میں دبوچ لیا اور اپنی ٹانگوں سے اس کا دھڑ قابو کر لیا۔

''یہ... یہ کیا... بد... تمیزی ہے... چھ چھوڑو مجھے!'' وہ بری طرح کسمانے لگا۔

جواباً ہم نے وہ ننھا سا تیز دھاری چاقو جو ہم نے بازار سے خریدا تھا۔ جیب سے نکال کے بھیم شاہ کی گردن پر رکھ دیا۔

اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''ہاں تو بھیم شاہ... تمہاری عمر کتنی ہے؟'' ہم نے بڑے آرام سے سوال کیا۔

''تت تت... تیس سال!'' وہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔

''ہممم! زیادہ نہیں ہے۔ یعنی ابھی تمہیں اور بھی جینا ہوگا... اچھا یہ بتاؤ

کہ... تمہاری شادی وادی...؟''

''ہو... ہونے والی ہے... دو ماہ بعد...'' اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''ہممم! پھر تو تم مرنا نہیں چاہتے ہو گے! ہرگز ہرگز!'' ہم نے ہرگز ہرگز پہ زور دیا۔

''تت... تم... چاہتے کیا ہو؟'' اس نے مچلتے ہوئے کہا۔

''زیادہ مچلو مت! اگر میرا ہاتھ تمہارے بدن کی لرزش سے ہل گیا تو تمہارا گلا میرے قدموں میں آ گرے گا... تم میری گرفت سے نکل بھی نہیں سکتے۔ تمہاری تنظیم نے مجھ پر شدید محنت کر کے مجھے زبردست لڑاکا بنا دیا ہے... ایک ہاتھ سے تمہیں دبوچ کے تین فٹ اوپر اچھال سکتا ہوں میں... خیر... میں بڑا بول نہیں بولتا یہ سب تمہاری ہی تنظیم کا کمال ہے!''

''تم چاہتے کیا ہو عمران بیگ؟''

''سچ سچ بتاؤ کہ وہ جو گفتگو ابھی تم کسی سے کر رہے تھے وہ کس سے کہاں کر رہے تھے اور کس پہ کر رہے تھے اور جس پہ کر رہے تھے وہ کہاں ہے اور اس گفتگو کا مطلب کیا تھا؟ چھ گھوڑے کون ہیں وہ منصوبہ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ!'' ہم نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''گفتگو! میں؟ کمرے میں تو اور کوئی بھی نہیں ہے!'' اس نے انجان بن کر کہا اور ہم نے اپنی گرفت اور مضبوط کر دی، وہ بلبلا اٹھا۔

''بتاتا ہوں بھئی بتاتا ہوں... لاہور بات کر رہا تھا۔ تنظیم کے دفتر۔ وائرلیس الماری میں رکھا ہے!''

''چھ گھوڑے!'' ہم نے اپنے بازو کی گرفت مضبوط کی۔

''مقامی بردہ فروش تھے، ڈوگو جگو نمبر دو وغیرہ۔''

''کہاں ہیں؟''

"لل......لاہور!"

"فرار کیسے ہوئے؟"

"مجھے نہیں پتا!"

ہم نے اسے اور زور سے بھینچ لیا۔

"سچ مچ نہیں پتا!" وہ چلا اٹھا۔

"ہم م م! اپنے منصوبے کی تمام تفصیلات سیدھی طرح اگل دو ورنہ میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا!" ہم نے سفاکی سے کہا۔

وہ ہچکچایا تو ہم نے چاقو اس کی گردن پہ رکھ کے ہلکا سا دبایا اور وہ چابی والے بندر کی طرح جھٹ بولنا شروع ہو گیا۔

☆☆☆

"کمینے! ذلیل! تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں زندہ چھوڑا جائے!" ہم نے طیش میں آ کر دانت پیسے۔ اس کی زبانی ان کا گھناؤنا منصوبہ سن کر ہمارا خون کھول اٹھا تھا۔

"اگر تم نے مجھے یا میرے ساتھیوں کو ذرہ بھی نقصان پہنچایا تو ہماری سرکار تم سے نبٹے گی!" اس نے گویا خبردار کیا۔

"تمہاری خر کار مائی فٹ! جلدی بتا یہاں کتنے کتے اور ہیں؟" ہم نے طیش میں آ کر پوچھا۔

"میں! میرے علاوہ دو چوکیدار، چار ٹریننگ ٹیچر اور چار شعوری لیکچرار!" چاقو کا دباؤ محسوس کرتے ہی وہ بولنے لگا۔

"اور وہ لڑکی... جو معلومات کی کھڑکی پر ہوتی ہے۔"

"Receptionist......اس کا نام تسنیم ہے......اسے اس بارے میں کچھ نہیں پتا......وہ بالکل لاتعلق ہے!"

"خوب! تنظیم کے اوقات یعنی چھ بجے کے بعد تم لوگ کیا کرتے ہو؟"

"تسنیم اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ باقی سب تمام دروازے کھڑکیاں بند کر کے یہاں Clinic میں جمع ہوتے ہیں اور اپنی کارگزاری اور کام کی رفتار سے آگاہ کرتے ہیں...... اس کے علاوہ اگر کچھ نئے احکامات ہوں تو ان پر عمل کیا جاتا ہے اور نئی تجاویز زیرِ غور لائی جاتی ہیں!"

"کب تک جمع ہوں گے؟"

"پہلے اپنی گرفت ڈھیلی کرو! میرا دم گھٹ رہا ہے!" اس نے بمشکل کہا۔

"مجھے کوئی پرواہ نہیں! سیدھی طرح سوال کا جواب دو!" ہم نے جان بوجھ کر اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔ وہ بلبلا اٹھا۔

"سس سس......ساڑھے چھ......" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

ہم نے فوراً گھڑی دیکھی...... چھ بج کے پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ 20 منٹ تھے اور ان 20 منٹوں میں کئی کام کرنا تھے لیکن سب سے پہلے بھیم شاہ کو ناکارہ کرنا تھا۔ رسی ملنا وہاں سے ذرا مشکل ہی تھا، بھیم شاہ کو جکڑے ہم اس کی میز تک آ پہنچے۔

میز میں کئی درازیں بنی تھیں، اوپر والی دراز تالے والی تھی جس میں چابی بھی لٹک رہی تھی۔ ہم نے سب سے پہلے اسے ہی کھولا۔

دراز میں سوائے ایک عدد سیاہ پستول کے کچھ نہیں تھا۔

"بہت خوب! پستول! ہاہ!" ہم نے طنزیہ کہا اور ایک ہاتھ سے پستول اٹھا کر بھیم شاہ کے ماتھے پہ عین آنکھوں کے بیچ دستے کی طرف سے پوری قوت سے دے مارا۔ اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور وہ ہمارے بازوؤں میں ڈھیلا پڑ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ مکمل بے ہوش تھا۔ لیکن ایک ہی پستول اس کے لیے کافی نہیں تھا نہ ہی ہمارا غصہ کم ہوا تھا۔ پستول کا دستہ مار مار کر ہم نے اس کا سر پھاڑ دیا اور جب اس کا چہرہ پورا خون میں ڈوب گیا تو ہمیں تسکین ملی۔ اگلا کام ہم نے اپنے چاقو سے ٹیلی فون

کے تار کاٹ کر کیا۔ اس کے بعد جلدی سے وہ الماری کھولی، اندر سے پیلے رنگ کا ایک وائرلیس رکھا تھا اور باقی الماری خالی تھی۔ ہم نے جلدی سے میز کی باقی درازوں کی بھی تلاشی لے ڈالی۔ لیکن ان سے بھی کوئی چیز نہیں ملی۔

چھ بج کے دس منٹ ہو گئے تھے۔ ہم نے پستول کھول کر چیک کیا اس میں چھ گولیاں تھیں۔ جبکہ ہمیں ابھی مزید دس آدمیوں پر قابو پانا تھا، وہ لوگ آیا ہی چاہتے تھے۔

''ہم م م! ایک پستول اور!'' ہم بڑبڑائے۔ ''لیکن کہاں سے کہاں سے حاصل کیا جائے؟'' ہم نے خود سے سوال کیا اور کمرے میں نظریں دوڑانے لگے۔ نظریں دوڑاتے دوڑاتے ہماری نظر اچانک ہی بھیم شاہ پر پڑی اور ہمارا خون پھر کھول اٹھا۔ آگے بڑھ کے ہم نے ایک تین ہارس پاور کی لات اس کی پسلیوں میں رسید کی اور باہر آ گئے۔

دفعتاً ہمیں یاد آیا کہ وہاں ایک اسٹور روم بھی ہے جہاں اسلحہ وغیرہ رکھا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دفاعی ٹریننگ میں پستول کم پڑ گئے تھے تو انسٹرکٹر اسٹور روم کا کہہ کر گیا تھا اور پستول لے آیا تھا۔

''لیکن اسٹور روم کہاں ہے!'' ہم چکرا گئے۔ لمحہ لمحہ قیمتی تھا اور اب تک پانچ منٹ ضائع ہو گئے تھے۔

ہم نے کچھ سوچا اور پھر جوتے اتار کر دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ہم ایسے میں بھی آواز پیدا نہ ہونے دے رہے تھے، گو کہ اندھیرا بڑھ گیا تھا پھر بھی دیکھ لیے جانے کا ڈر تھا، لیکن ہم اس وقت ڈر کو طاق پر رکھ کر بھاگے چلے جا رہے تھے۔

بھاگتے بھاگتے دفعتاً ہمیں ایک کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر Store Room لکھا نظر آیا اور ہم بے سوچے سمجھے اندر گھس گئے اور بری طرح سٹ پٹا گئے۔ اندر ایک آدمی پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ شاید اسلحہ وغیرہ واپس رکھنے آیا ہوگا۔

اب ہم کہیں چھپ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ پیچھے مڑ کر ہمیں دیکھ چکا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟ تمہیں معلوم نہیں ہے یہاں عام ارکان کا داخلہ ممنوع ہے!'' وہ گھورتے ہوئے بولا۔

''جی وہ...... اصل میں میں نے یہ پورا مرکز دیکھا ہوا نہیں تھا اس لیے آج چکر لگاتے لگاتے ادھر آ گیا۔'' ہم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں! چھٹی تو ہو چکی اب کیا کر رہے ہو؟ گھر جاؤ!''

''جاتے ہیں!'' ہم مسکرائے اور مڑ کر اچانک دروازہ بند کر دیا۔

''یہ کیا؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''اصل میں مجھے آپ کو ایک راز کی بات بتانا ہے!'' ہم نے اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''کیا؟''

''ایسے نہیں کان میں بتاؤں گا!''

''یہ لو کان!'' وہ کان قریب لے آیا اور ہم نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کا بھی بھیم شاہ جیسا حشر ہوا ہوا تھا۔

ہم نے وہاں سے دو پستول اٹھانے کے ساتھ ساتھ ایک خنجر بھی اٹھا لیا۔ اس سے پہلے ہم وہیں سے ایک موٹی مضبوط رسی ڈھونڈ کر اسے باندھ چکے تھے اور اب باقی رسی ہمارے کندھے پر تھی۔

چھ بیس ہو چکے تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہم کلینک کی طرف چلے اور جب وہاں پہنچے تو چھ بج کر پچیس منٹ ہو گئے تھے۔

ہم اندر چھپ کر باقی نو آدمیوں کا انتظار کرنے لگے۔

☆☆☆

ٹھیک ساڑھے چھ بجے Clinic کا دروازہ چرچرایا اور ایک ایک کر کے تمام نو

آدمی اندر داخل ہو گئے۔

"ارے یہ بھیم شاہ کو کیا ہوا!" سب سے آگے والا اس کی طرف لپکا۔ باقی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

چپکے سے آگے بڑھ کر ہم نے بغیر آواز پیدا کیے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

اب باہر سے کوئی اور نہیں آ سکتا تھا۔

"بھیم شاہ! بھیم شاہ!" آگے والا بھیم شاہ کے گال تھپتھپانے لگا۔

"تم سب ہاتھ اوپر اٹھا دو!" ہم نے زوردار آواز میں کہا اور وہ سب اچھل پڑے۔

"عمران بیگ! تم کیا کر رہے ہو یہاں!" یہ ہمارا شوری لیکچرار تھا۔

"وہی جو بھیم شاہ کو کیا ہے اور جواب تم لوگوں کو کروں گا!" ہم نے دونوں پستولیں ان کی طرف تانی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" وہ غرایا۔

"مذاق نہیں...... مجھے تمہارے منصوبے کے بارے میں سب پتا چل گیا ہے! تم لوگ ایک ایک کر کے بڑھو اور تمہاری جیبوں میں جو کچھ ہے نکال کے بھیم شاہ کی میز پر رکھ دو!" ہم نے پستول سے میز کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کے لو ساکت کھڑے رہے۔

"چلو! یہ نقلی پستولیں نہیں ہیں!" ہم غرائے۔ "اور اس خوش فہمی میں نہ رہو کہ تمہارا دسواں ساتھی آتا ہوگا...... وہ اسلحہ اسٹور میں سیخ کباب کی طرح رسی میں لپٹا پڑا ہے!"

"آگے والا ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا آگے بڑھا اور اپنی جیبیں خالی کرنے لگا۔

ہمارا اشارہ پا کر باقیوں نے بھی باری باری اپنی جیبیں خالی کرنا شروع کر دیں۔

آخر میں ہمارا شوری لیکچرار آگے بڑھا اور اپنی جیب میز پر الٹ کر واپس جانے لگا، لیکن اچانک ہی مڑ کے اس نے میز پر رکھا پیپر ویٹ اٹھایا اور تیزی سے ہمارے سر پر دے مارا۔ ہم فوراً نیچے بیٹھ گئے اور پیپر ویٹ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

"مجھے معلوم تھا تم کچھ نہ کچھ ضرور کرو گے اس لیے میں پہلے سے محتاط تھا!" ہم مسکرائے۔

"تم نے یہ پستولیں کہاں سے حاصل کیں؟" ایک سرد آواز میں بولا۔

"ایک تو تمہارے پیارے ساتھی بھیم شاہ کی ہے اور دوسری اسلحہ اسٹور"

"ہم نو ہیں جبکہ تمہارے پاس گولیاں صرف چھ!" وہ ہنسا۔

"دوسری پستول بھی بھری ہوئی ہے مسٹر!"

"اسلحہ روم میں رکھی جانے والی پستولیں بھری ہوئی ضرور ہوتی ہیں لیکن نقلی گولیوں سے!" وہ ہنسا اور باقی بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔

"نقلی گولیاں!" ہم دھک سے رہ گئے۔

❁❁❁

چوتھا باب

برے پھنسے!

یہ بات تو ہمیں یاد ہی نہیں تھی کہ ٹریننگ کے پستولوں میں نقلی گولیاں ہوتی ہیں لیکن اس وقت گھبرا جانے کا مطلب موت کو دعوت دینا تھا۔

''تم لوگوں نے پوری بات کہاں سنی! میں نے کہا کہ دوسری پستول اسلحہ اسٹور میں جو آدمی تھا اس کی جیب سے نکالی گئی ہے...... اب ظاہری بات ہے...... تم لوگ تو نقلی لے کر گھوم نہیں رہے ہوگے!'' ہم مسکرائے اور ان کا چہرہ غصے میں بھر گیا۔

''چلو! دیوار کی طرف منہ کرو!'' ہم غرائے اور وہ اباؤٹ ٹرن ہو گئے۔

میز پر رکھی چیزوں میں کچھ نقدی، زرد رنگ کے کارڈ اور نو عدد پستولیں بھی تھیں جو ان ہی کی جیبوں سے برآمد ہوئی تھیں۔ ہم جلدی سے آگے بڑھے اور اسلحہ روم سے حاصل کی ہوئی پستولیں میز پر رکھ کر ان نو میں سے دو پستولیں اٹھالیں اور سکون کا سانس لیا۔

''اب تم لوگوں کا کیا کیا جائے؟'' کندھے پہ سے گرتی رسی ٹھیک کرتے ہوئے ہم نے پوچھا۔

وہ چپ کھڑے رہے۔

ہم نے بھیم شاہ والی پستول تان کر نشانہ باندھا اور بے دریغ گولی چلادی۔

☆☆☆

پہلا اپنی ٹانگ پکڑ کر چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔

''ٹھائیں! ٹھائیں! ٹھائیں!'' کچھ ہی دیر بعد نو کے نو ٹانگ پکڑے زمین پر

پڑے تھے۔

''چچ چچ چچ!'' ہم نے تاسف کا اظہار کیا۔

''کچھ ہی دیر بعد ان نو کے نو کو بھیم شاہ سمیت رسی سے باندھ کر مزید زخمی حالت میں چھوڑ کر ہم پولیس اسٹیشن اڑے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆

تیز تیز قدم اٹھاتے ہم سیدھے پولیس اسٹیشن میں گھس گئے اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انسپکٹر کی میز پر انسپکٹر شہباز کو بیٹھا پایا۔ کیونکہ علاقے کے انسپکٹر کوئی دوسرے صاحب تھے۔

انسپکٹر صاحب میز پر ایک بڑا سا ریڈیو رکھے F.M نشریات سن رہے تھے۔ نہ صرف سن رہے تھے بلکہ فون کان سے لگائے لائیو کال پر بات بھی کر رہے تھے۔

''اوہ جی بس! آپ کی واز بڑی اچھی ہے!'' انہوں نے کھلکھلا کر خاتون میزبان کی تعریف کی۔ آواز کا ''آ'' وہ چبائے بغیر نگل گئے تھے۔

''جی! گانڑاں جو میں نے سنڑاں ہے...... اوہ ہے جی...... نائد اختر کی واز میں گرم گلابی شام ہے تارا رما کر مبا!'' ''ہے!'' کہتے ہوئے ان کا دہانہ 380 ڈگری پھیل گیا۔

ہم خون کے گھونٹ پیتے رہے۔

''جی میں نے سرگودھا میں اپنے سالے کو پیغام بھی دینڑاں ہے...... جی کیا کہا؟ سرگودھا میں نشریات نہیں جاتی؟ اوہ جی خیر ہے کوئی گل نہیں...... لور میں تو جاتی ہیں ناں! ہاں تو جی لور میں اپنی سالی کو پیغام دینڑاں ہے کہ سرگودھا میں وہ میرے سالے کو پیغام دے...... ایں جی! ہیلو جی! اے لو جی! بند ہی کر دیا!'' انہوں نے منہ بنڑاں کر فون رکھ دیا۔

''جی آپ نے میرے ساتھ چلواں ہے!'' بے اختیار ہمارے منہ سے نکل گیا۔

"کہاں بیٹا جی؟" وہ گویا ہوئے۔

"ویسے آپ اس تھانے میں کیا کر رہے ہیں؟" ہم نے تجسس سے پوچھا۔

"او میا! میرا ٹرانسمٹر ہو گیا ہے!" وہ بے زاری سے بولے۔

"ٹرانسمٹر!! اوہ اچھا ٹرانسفر!" تھوڑی دیر بعد ہماری سمجھ میں آیا۔

"خیر...... بات دراصل یہ ہے کہ......"

☆☆☆

"او یہ تم کیا کے رئے ہو!" ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"سچ کے ریا ہوں! ام میرا مطلب ہے کہہ رہا ہوں......"

"مارلیا ناں میدان! اب کی بار میری ترکی پکی!" انہوں نے خوش ہو کر تالی بجائے۔

"ترکی!" ہم سر کھجانے لگے۔

"اوہی بھی Permission Permission؟"

"Pro Motion" ہم چہکے۔

"ہاں!" انہوں نے ڈکار لی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم انسپکٹر صاحب کی جیپ میں بیٹھے تنظیم کے دفتر اڑے چلے جا رہے تھے، پیچھے چار جیپوں میں نفری آ رہی تھی۔

☆☆☆

دفتر کے گرد گھیرا ڈال کر انسپکٹر صاحب، ہم اور بارہ سپاہی سیدھے بسیم شاہ کے Clinic میں گئے۔ وہ دس کے دس ہوش میں تھے۔ بسیم شاہ بھی ہوش میں آ چکا تھا البتہ ان سبھی کا خون کافی تعداد میں بہہ چکا تھا اور ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔

انہیں گرفتار کر کے ہم لوگوں نے اسٹور روم والے شخص کو گرفتار کیا اور اسٹور روم میں موجود تمام اسلحہ پولیس نے اپنے قبضے میں لے کر تنظیم کا دفتر سیل کر دیا۔

اس کے بعد ہم انسپکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے گھر لوٹ گئے۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر ہم نے امی سے بہانہ بنا دیا کہ کلاس کے بعد ایک دوست کے گھر چلے گئے تھے اس لیے دیر ہو گئی اور خوش خوش اپنے کمرے میں چلے آئے۔

آج ہم نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا اس پر ہمارا سر فخر سے بلند تھا اور ہمارے دل میں لڈو پھوٹنے پڑ رہے تھے۔

لیکن ایک گھنٹے بعد انسپکٹر شہباز نے فون کر کے جو مژدہ سنایا وہ ہمارے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

"یہ کیسے ہو سکتا ہے انکل!" ہم اپنی حیرت اور خوف پر قابو پاتے ہوئے بولے:

"او ہی میں نہیں جانتا کیسے ہو سکتا ہے لیکن ہو چکا ہے! تم فوراً یہاں چلے آؤ!"

انہوں نے چڑ کر کہا اور فون کا ریسیور پٹخ دیا۔

ہم کچھ دیر تک وہاں گم سم کھڑے رہے۔

کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ امی ابا جان کو اس معاملے کی ہوا اس لیے لگنے نہیں دی تھی کہ سوچا تھا کہ سارا معاملہ ختم ہونے کے بعد جب اخباروں میں ہماری تصویر شائع ہو گی تو انہیں سرپرائز دیں گے۔ لیکن یہاں تو انسپکٹر شہباز ہی ہمیں سرپرائز دے گئے تھے۔

ہچکچاتے ہوئے ہم ابا جان کے کمرے کی طرف چلے۔

"ہمممم!" ابا جان نے ہمیں دیکھا۔ "ٹھیک ہے! سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا لیکن تم اب اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"ابا جان وہ...... وہ بات دراصل...... دراصل بات یہ ہے کہ......" ہم بری طرح ہچکچانے لگے۔

"ہاں ہاں کیا بات ہے؟ جلدی بولو!" ابا جان پریشان ہو کر چلائے۔

"وہ...... بھو بھو...... بھو!"

"کیا بھو بھو کر رہے ہو!"

"بھو...... بھیم شاہ......" ہم ہکلائے۔

"ہاں ہاں بھیم شاہ! لیکن کیا بھیم شاہ؟" ابا جان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"بھیم شاہ نے حوالات میں دم توڑ دیا!" ہم نے ایک دم کہا۔

"کیا!" ابا جان چلائے۔

ہمارا سر جھکتا چلا گیا۔

☆☆☆

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"یہ سچ ہے ابا جان! اور انسپکٹر شہباز نے ابھی فون کر کے ہمیں تھانے بھی بلایا ہے۔" ہم نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"کچھ ہی دیر بعد ہم اور ابا جان تھانے جا رہے تھے۔

☆☆☆

"آخر ضرورت تھی کیا یہ سب کرنے کی؟ دیکھ لیا ماں باپ سے جھوٹ بولنے کا انجام؟ اب سیدھا سادا پولیس کیس بن جائے گا اور بھگتیں گے ہم!" ابا جان بری طرح غصے میں تھے۔

ہم سارے راستے چپکے بیٹھے رہے۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ اب ہم پر قتل اقدام قتل کا خدانہ کرے مقدمہ بن جائے گا اور ہم......اف خدایا! جذبات میں آ کر یہ ہم کیا کر بیٹھے!

☆☆☆

"آؤ بھئی......" انسپکٹر شہباز نے بجھے بجھے انداز میں ہمارا استقبال کیا۔

"انسپکٹر صاحب یہ ہم کیا سن رہے ہیں!" ابا جان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سچ سن رہے ہیں جی! بھیم شاہ یہاں لائے جانے کے دس منٹ بعد ہی ڈُم توڑ گیا!" انسپکٹر شہباز نے آہ بھری۔

"دَم!" ہم نے آہستہ سے تصیح کی۔

"چپ اوئے! تمہاری وجہ سے میرا کانتراں بھی مس ہو گیا!" انہوں نے ہمیں جھاڑ پلا دی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" ابا جان نے تنگ آ کر پوچھا۔

"آئیں جی میرے ساتھ!" انسپکٹر شہباز اٹھے اور ہم دونوں بھی ان کے پیچھے پیچھے حوالات تک چلے آئے۔

حوالات کی سلاخوں سے بقیہ زندہ مجرم سر لگائے بیٹھے تھے جبکہ ایک وکیل نما آدمی (جو بعد میں صرف وکیل ثابت ہوا) غصے میں بھرا کھڑا تھا۔ اس کا کوٹ پہنے پہنے کالا ہو چکا تھا۔

"وکیل صاحب...... یہ ہیں بھئی!" انسپکٹر صاحب نے بیزاری سے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"وکیل شعلے برساتی آنکھوں سے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"معاملہ کیا ہے جناب؟" ابا جان نے دخل دیا۔

"جو شخص اتنی کچی عمر میں ایک آدمی کو شدید تشدد کا نشانہ بنا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دے اور دیگر کو زخمی کر دے، جو گولی چلانے میں ذرا نہ جھجکے وہ پختہ عمر میں کیا کیا کر سکتا ہے آپ خود اندازہ لگا لیں!" اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی موت کی وجہ میرا بیٹا بنا ہے؟" ابا جان چیختے ہوئے لہجے میں بولے۔

"ہیم شاہ کی لاش دیکھ لیں...... اس کے بدن پر موجود چوٹوں سے اندازہ ہو جائے گا آپ کو کہ اس پر کتنا تشدد کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں وہ یہاں لائے جانے کے دس منٹ بعد ہی دم توڑ گیا۔"

"آپ جن کی وکالت کر رہے ہیں ان کا جرم جانتے ہیں؟"

"کیا جرم ہے ان کا؟ کیا جرم ہے؟ دفتر میں موجود تمام نقدی اس بدمعاش کے حوالے نہ کرنا جرم ہے یا لوگوں کو عقل دلانا جرم ہے؟" یہ بولا اور ہماری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

ہم پر الزام یہ لگایا گیا تھا کہ ہم نے غصے میں آ کر بغیر کسی بات کے تنظیم کے افراد سے جھگڑا کیا...... گن پوائنٹ پر ان سے تمام نقدی مانگی اور ان کے انکار کرنے پر گولی چلا دی۔

"لیکن آپ اپنے موکلوں پر لگائے الزام جانتے ہیں......؟" ہم زور سے بولے۔

"جانتا ہوں...... اور اگر تم وہ الزام ثابت کرنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کوئی ٹھوس ثبوت نہ لا سکے تو پچیسویں گھنٹے کے پہلے منٹ تم خود حوالات میں ہو گے اور تم پر کیس کر دیا جائے گا!" وہ یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا اور ہم ساکت کھڑے رہ گئے۔

"اب کیا ہوگا ضیا؟" انسپکٹر شہباز بجھے بجھے لہجے میں بولے۔

"ہم م م!" ہم چونک گئے۔ "اب؟ اب ہم ثبوت لائیں گے!"

"کون سا ثبوت، کہاں کا ثبوت؟" ابا جان جھلا گئے۔

"ہیم شاہ کی Clinic میں الماری میں رکھا زرد وائرلیس!" ہم نے پرجوش ہو کر کہا۔

"چلو پھر! چلیں!" انسپکٹر شہباز نے اکتا کر کہا اور ہم ابا جان اور انسپکٹر شہباز

کے ساتھ تنظیم کے دفتر چل دیے۔

☆☆☆

ہم لوگ اس وقت اپنی ذاتی گاڑی میں تنظیم کے دفتر کی جانب رواں دواں تھے۔ انسپکٹر شہباز نے جانے کیوں نفری اور سرکاری جیپ میں جانا پسند نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس میں F.M Stereo نہیں تھا!

"لاحول ولاقوۃ! حد ہو گئی! اتنا بڑا اقدام بنا سوچے سمجھے بغیر کسی کو بتائے۔ اب یہ تو ہونا ہی تھا!" ابا جان شدید ناراض تھے۔

"چھوڑیں جی چھوڑیں...... جانے دیں!" انسپکٹر شہباز نے اسٹیرنگ کو کسی مجرم کی گردن سمجھ کے مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا۔ یہ بھی انہی کی فرمائش تھی کہ گاڑی وہ چلائیں گے۔

"کیا جانے دیں! اگر کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل سکا تو کیا ہوگا!"

"جانے دیں جی بچہ ہے...... آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ اس نے کام کتنا بڑا کیا ہے!" انسپکٹر شہباز نے سگنل توڑتے ہوئے کہا۔

"کیا بچہ ہے! شکل تو دیکھیں اس کی!"

انسپکٹر شہباز نے فوراً گردن موڑ کر ہمیں دیکھا...... ٹھیک اسی وقت ہماری نظر باہر پڑی۔ ایک ٹرک تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہا تھا۔

"آ آ آ...... ٹرک! ٹرک ٹرک!" ہم چیخے۔

انسپکٹر شہباز نے چونک کر سامنے دیکھا اور ان کے ہوش اڑ گئے۔ گھبراہٹ میں گاڑی انہوں نے ٹرک ہی کی طرف موڑ دی۔

"ارے باپ رے! یہ تو اور قریب آ گیا!" وہ سمجھے کہ ٹرک گاڑی کے نزدیک آ گیا ہے۔

ٹرک ڈرائیور کے منہ میں نسوار تھی، لہٰذا وہ پورے ہوش و حواس میں تھا اس نے

کمال ہوشیاری سے ٹرک دوسری طرف گھمالیا لیکن پھر بھی گاڑی کا بونٹ رگڑتا ہوا گزر گیا۔

گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔

انسپکٹر شہباز کچھ دیر بیٹھے کان کھجاتے رہے...... پھر تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے کود پڑے۔

"آپ چلائیں جی میں ذرا تھک گیا ہوں!" انہوں نے ابا جان سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد اسٹیرنگ ابا جان کے ہاتھ میں تھا اور انسپکٹر شہباز برابر والی سیٹ پر بیٹھے سائیڈ مرر میں دیکھتے ہوئے مسلسل اپنی مونچھوں کو سہلا رہے تھے۔

☆☆☆

"یہ ہے بھیم شاہ کا Clinic اور اس الماری میں زرد رنگ کا وائرلیس رکھا ہے۔"

"ہم م م م!" انسپکٹر شہباز نے ہنکارا بھرا اور الماری کا رخ کیا۔

"اوضیا یہ وائرلیس تھوڑا ہی ہے!" انہوں نے اس چیز کا جائزہ لیا۔

"تو پھر؟" ہم پریشان ہوگئے۔

"یہ تو ٹرانسمیٹر ہے!"

"کچھ تو ہے ناں!"

"ہاں مگر...... نہ ہونے کے برابر ہی ہے!" انہوں نے ٹرانسمیٹر کا ایکسرے کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب!" ہماری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"اوضیا! یہ ٹرانسمیٹر ایک دم بے کار ہے! کسی کام کا نہیں ہے! یہ تو صرف کھوکھا ہے!"

"یعنی؟" ہمارا دل ڈوبنے لگا۔

"یعنی یہ کوئی ثبوت ہی نہیں ہے! ٹھوس مائع گیس تو پھر بعد کی بات ہے!" انسپکٹر شہباز نے مری مری آواز میں کہا۔

ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے تارے ناچتے محسوس ہوئے۔

❀❀❀

پانچواں باب

آخری چال

"اب کیا ہوگا!" ہم نے بمشکل کہا۔

"تیرا سر ہوگا الو دی دُم!" انسپکٹر شہباز پھٹ پڑے۔ "میری ترقی تو دور کی بات ہے اب تو میری وردی بھی خطرے میں ہے۔ تمہاری باتوں میں آنے کے نتیجے میں میری تنزلی نہ ہو جائے!"

"اب آپ کیا کریں گے؟" ہم نے پوچھا۔

"F.M فون لگاؤں گا اور اقبال بانٹروں کا دستِ تنہائی میں سنوں گا!"

"کھی کھی کھی!" ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔

"چلو بھئی بادشاہو! آپ کا تو بیٹا سرک گیا! چلیں اب فائدہ ہو جائے گا ہم کہہ دیں گے کہ لڑکے کا ذہنی توازن بچپن سے ٹھیک نہیں ہے اس لیے اس کو معاف کر دیا جائے۔"

"انکل میں پاگل نہیں ہوا ہوں......" ہم نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "......وہ گانا دستِ تنہائی میں نہیں ہے دشتِ تنہائی میں ہے!"

"اوپر اوپر سے کوئی آرڈر شارڈر آ گیا تو مجھے تو دست لگ جانے ہیں...... کہاں میں دوسری شادی کا منصوبہ بنا رہا تھا اور اب ماتم کرنے کا دل چاہتا ہے!" انہوں نے غصے سے کہا۔

دفعتاً ہمارے دماغ میں بجلی سی کوندی۔

"ارے انکل! ایک اور آئیڈیا!" ہم نے پرجوش انداز میں کہا۔

"معاف کریں جی! اپنے آئیڈیے گٹر میں انڈیل کر اوپر سے ڈھکن لگا دے میری نوکری پہلے ہی خطرے میں پڑ گئی ہے!"

"انکل آپ کی نوکری خطرے میں ہے لیکن میری تو زندگی کا سوال ہے...... صرف بائیس گھنٹے بچے ہیں ثبوت کے لیے پلیز......" ہم نے لجاجت سے کہا۔

"اچھا بولو کیا آئیڈیا ہے؟" وہ نرم پڑ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گاڑی میں ایک دوسرے مقام کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

دروازہ کھٹکھٹانے کے کچھ دیر بعد اندر سے ایک ہماری عمر کا لڑکا نمودار ہوا۔

"جی فرمائیے!" اجنبی چہرے دیکھ کر وہ کچھ حیرت زدہ سا ہو گیا...... اندھیرا ہونے کے باعث اس کی نظر انسپکٹر شہباز کی وردی پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ شاید وہیں چکرا جاتا۔

"مس تسنیم ہیں؟" انسپکٹر شہباز نے پوچھا۔

"باجی! جی ہیں تو لیکن...... آپ کون لوگ ہیں؟"

"انسپکٹر صاحب نے کچھ کہنا چاہا مگر ہم نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"ان سے کہو عمران بیگ آیا ہے!" ہم نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا اور وہ اندر چلا گیا۔

"جھوٹ بولا پتر تو نے؟ بولا جھوٹ؟" انسپکٹر شہباز نے جذباتی ہو کر پوچھا۔

"بھئی وہ مجھے عمران بیگ ہی کے نام سے تو پہچانتی ہے ناں! آپ ہر وقت پیٹ ہی سے سوچا نہ کریں!" ہم جل گئے۔

انسپکٹر صاحب کھسیانے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

اسی لمحے وہ لڑکا دوبارہ دروازے میں آیا اور ہمیں ہلکی سی آواز اور سر کے اشارے سے اندر آنے کا کہا۔ ہم لوگ اندر داخل ہو گئے۔ وہ ہمیں ڈرائنگ روم تک

لے آیا۔

اندر تسنیم حیران پریشان سی کھڑی تھی۔ اوپر سے انسپکٹر صاحب کی وردی دیکھ کر گھبرا بھی گئی۔

''خ......خیریت تو ہے......بیٹھ جایئے......''

''خیر اب خیر خیریت تو خیر دور دور تک نہیں ہے......خیر خیریت کی خیر تک خیر خبر نہیں ہے!'' انسپکٹر شہباز کے پاس جتنے ''خ'' تھے انہوں نے سارے خرچ کر ڈالے۔

''خیریت کو اتنے بے خوف ہو کر خرچ کر دیں گے تو خیریت تو خیر رہ ہی نہیں سکتی!'' ہم نے جل کر کہا۔

''تم کیوں اتنے خونخوار بن رہے ہو؟ تمہارے خطرناک تیور دیکھ کر میرا خون خشک ہو رہا ہے!''

''اور میرا خون کھول رہا ہے!''

''یہی تو خون کا خاصہ ہے کہ خشک بھی ہوتا ہے اور کھولتا بھی ہے!'' وہ خوش ہو کر بولے۔

''اگر تم لوگ اسی بے خوفی سے فراخدلانہ انداز میں خے کا بے خطر ہو کر خرچ کرتے رہے تو خے کا خون تم لوگوں کی گردن پر ہوگا اور تب میں تمہاری خیریت پوچھوں گا!'' ابا جان نے تنگ کر کہا۔

''خیر خیر......اف! یہ خبیث خے پھر آ گیا!'' انسپکٹر شہباز نے سر پیٹ لیا۔

''بات تم کرو گے یا میں کروں؟''

''آپ کر لیں!'' ہم نے ان کے بڑے ہونے کا لحاظ کیا۔

''ہاں تو خاتون!'' انسپکٹر شہباز نے جان بوجھ کر ''خ'' کا استعمال کیا۔

''معاملہ کچھ یوں ہے کہ......''

☆☆☆

''اف خدایا! کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں!'' تسنیم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ

گئیں۔

''ارے نہیں محترمہ! میں تو اپریل فول منا رہا ہوں!'' انسپکٹر شہباز ہنسے۔

''جی میں سمجھی کہ آپ......''

''آپ سمجھیں کہ میں شغل کر رہا ہوں۔ میرا دماغ خراب ہے ناں جو رات کے ساڑھے بارہ بجے تھا خواں چھوڑ کر یونی فارم میں آپ سے ہنسی ٹھٹھول کرنے آیا ہوں!''

''جی نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا! میں سمجھی تھی آپ مذاق کر رہے ہیں!'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔

''مذاق! یعنی کہ مخول! میں آپ کو شکل سے مخولیہ نظر آتا ہوں؟ میں نے بالوں سے سویاں باندھی ہوئی ہیں یا آپ کو ایک ٹانگ پر ناچ کر دکھا رہا ہوں؟ آپ نے کہا کیسے میں مخول کر رہا تھا؟ مخولیہ میں نہیں، بلکہ یہ ہے یہ!'' انہوں نے ہمارا منہ پکڑا اور حسب عادت دونوں گال آپس میں ملا کر تسنیم کو دکھایا۔ جیسے کسی بکرے کے دانت دکھائے جاتے ہیں۔

''یہ ہے مخولیہ! بلکہ ابوالمخول ہے! ابوالمخول!''

''جی ہاں! اور آپ ابوالہول ہیں!'' ہم نے غصے سے کہا۔

''شٹ آپ!'' انہوں نے منہ پھاڑا۔

''آخر آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' تسنیم پریشان ہو گئی۔

''آپ میرے کچھ سوالوں کا جواب دیں!'' ہم نے جلدی سے کہا۔ اس ڈر سے کہ کہیں انسپکٹر صاحب بیچ میں اپنی توند نہ اڑا دیں۔

''نمبر ایک، تنظیم کے لیے آپ کب سے کام کر رہی ہیں؟ میرا مطلب ہے Receptionist کی کرسی پر!''

''میں چار ماہ سے ہوں اس پوسٹ پر!''

''آپ کو نوکری ملی کیسے تھی؟''

''اخبار میں اشتہار آیا تھا، تنظیم کے اسی دفتر کا پتا تھا۔ میں گئی تھی اور ایک

چھوٹے سے انٹرویو کے بعد مجھے نوکری دے دی گئی تھی!''

''تنخواہ؟''

''ساڑھے پانچ ہزار! انہوں نے کہا تھا کہ چھ ماہ بعد سات ہزار کر دیں گے!''

''لیکن آپ کو نوکری کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''میرے گھر کا چھپر نہیں چھٹ رہا تھا جو میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی!''
تسنیم نے بھنا کر کہا اور اچانک ہی پورا صوفہ ہلنے لگا۔

''ہے ہے ہے!'' ہم نے دیکھا انسپکٹر شہباز دانت نکال رہے تھے۔

''میرا والد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ امی ضعیف ہیں، گھر میں سب سے بڑی میں ہوں اور باقی دونوں چھوٹے بھائی پڑھ رہے ہیں! ظاہری بات ہے مجھے نوکری کرنا ہی تھی!'' اس نے اپنا غصہ قابو کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! اب ایک اہم سوال...... یہ زرد رنگ کا آخر کیا چکر ہے؟''

''مجھے نہیں پتا...... میں جب انٹرویو کے لیے گئی تھی تو میرے سامنے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ نوکری کرنا ہے تو زرد رنگ کی اشیاء استعمال کرنا ہوں گی جو وہ خود فراہم کریں گے...... ورنہ نوکری نہیں ملے گی!''

''اور آپ نے شرط منظور کر لی!''

''ظاہری بات ہے نوکری کا سوال تھا!'' وہ جھنجلا گئی۔

''آپ نے اس شرط کی وجہ نہیں پوچھی؟ اس کا راز؟'' ہم نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''پوچھا تھا اور مجھے بھی یہی جواب ملا تھا کہ مالک کی مرضی ہے!''

''ہم م م م!'' ہم کچھ سوچنے لگے۔

☆☆☆

تسنیم سے اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا...... وہ بیچ بچ لاتعلق تھی...... نہ ہی وہ اس تنظیم کے بارے میں کچھ جانتی تھی اور نہ ہی اس کے پاس اسٹاف کا پتا وغیرہ تھا۔ ہاں البتہ اس

کے پاس تنظیم کے دیگر مرکزوں کے پتے موجود تھے کہ دوسرے شہروں میں کس علاقے میں یہ دفتر ہیں، ہم نے اس سے یہ پتے ایک لسٹ پر لکھوا لیے تھے اور اپنے پاس رکھ لیے تھے۔

☆☆☆

تسنیم کے گھر سے ہم باہر آئے تو رات کا ایک بج چکا تھا اور ابھی تک کوئی ثبوت ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔

اچانک ہی انسپکٹر شہباز کی نظر گاڑی کے ٹائر پر پڑی اور وہ اچھل پڑے۔

''اے لو جی! ٹیر تو پنچر ہے!''

''کیا!'' ہم نے بے یقینی کے عالم میں کہا اور ٹائر دیکھا، وہ واقعی ''پنچر'' تھا۔

''اف! دیر پر دیر!'' ہم نے جھنجلا کر ٹائر کو لات ماری۔

''لاؤ میں ابھی دوسرا ٹائر نکال کر لگا دوں!'' انسپکٹر شہباز گاڑی کی ڈگی کی طرف بڑھے۔

ہم نے چابی ان کی طرف اچھال دی جسے انہوں نے صفائی سے کیچ کر لیا۔

اب انہوں نے ڈگی کھول کر ٹائر اور جیک نکالا اور بچوں کی طرح ٹائر لڑھکاتے ہوئے ہم تک لے آئے۔

''بس منٹوں کی بات ہے، میں نے بڑے بڑے پنچر نکالے ہیں یہ چھوٹا سا ٹیر کیا چیز ہے!'' انہوں نے کندھوں تک آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔

آستین چڑھانے کے بعد وہ بیٹھنے کے لیے جھکے لیکن ان کی توند آڑے آ گئی۔

''دھت!'' انہوں نے توند پر ہاتھ مارا۔ زیادہ تنگ نہ کر! کام کرنے دے!''

اپنی توند کو نصیحت کرنے کے بعد وہ دوبارہ بیٹھنے کی تگ و دو کرنے لگے لیکن ہر بار ان کے گھٹنوں اور سینے کے بیچ ان کی توند آ جاتی۔

''ہوں! ہوں! ہے! ہوئی!'' انسپکٹر شہباز زور لگا کر بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ غوطہ خوری کی پریکٹس کر رہے ہیں یا کوئی ان سے اٹھک بیٹھک

کروار ہا ہے۔

”رہنے دیں آپ کا ٹائر بار بار بیچ میں آئے گا!“ ہم نے منہ بنا کر کہا۔

”کی مطلب؟“ انہوں نے ایک اور غوطہ لگایا۔

”میرا مطلب ہے آپ کا پیٹ بیچ میں آتا رہے گا...... ٹائر مجھے دے دیں!“

”ہاں میرا خیال ہے اب اپنے پیٹ میں کچھ پنچر شنچر لگانا ہی پڑیں گے...... بہت ستانے لگا ہے!“ انہوں نے گاڑی کا ٹائر ہماری طرف لڑھکا دیا اور خود اپنے ٹائر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

جب ہم ٹائر بدل کر کھڑے ہوئے تو مزید بیس منٹ ضائع ہو چکے تھے ابا جان کی شکل پر شدید بے زاری تھی جبکہ انسپکٹر شہباز اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ناخن سے خلال کر رہے تھے۔

”ہو گیا پتر؟“

”ہو گیا!“

”اب کہاں جانا ہے؟“ ابا جان نے پوچھا۔

”میرے خیال سے آپ کو ہم گھر چھوڑ دیتے ہیں...... امی اکیلی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ ان کی ہمت بندھائیے گا اور خود بھی حوصلہ رکھیے گا...... میں اور انسپکٹر شہباز ان شاء اللہ چوبیس گھنٹے سے پہلے کوئی ثبوت ڈھونڈ ہی لیں گے!“ ہم نے کہا اور ابا جان نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ابا جان کو گھر پہ اتارنے کے بعد کچھ دیر تک ہم گاڑی ادھر ادھر نچاتے رہے پھر ایک سڑک پر کونے میں روک دی۔

”کی ہویا پتر؟ پٹرول ختم ہو گیا؟“ انسپکٹر شہباز نے پوچھا۔

”ہوں! نہیں!“ ہم نے نفی میں سر ہلایا۔

”کی سوچ رہے او تسی؟“

”سوچ رہا ہوں اب کیا کریں؟ کون سا ثبوت ڈھونڈیں! اللہ جانے اب کیا ہو گا!“ ہم نے فکرمندی میں اسٹیرنگ سے سر لگایا۔

”اب کیا ہو گا! ہو گا اچھا ہو گا! او غم نہ کر یار! وہ کیا شعر ہے کہ:

انسپکٹر صاحب کوئی شعر یاد کرنے لگے۔

”ہاں!“ انہوں نے چٹکی بجائی۔ ”باقی نہ رہے ساکھ ادا دشت جنوں کی۔ دل میں اگر اندیشہ انجام ہی آئے!“ انہوں نے باقاعدہ گنگنا کر شعر پڑھا اور ہم چونک گئے۔

”شعر تو آپ نے بہت اچھا پڑھا ہے۔“ ہم نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”بس پتر! ایک یہی غزل ساری زندگی میں یاد کی ہے! اکثر F.M پر سنتا ہوں!“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ہمارے پاس تقریباً 19 گھنٹے بچے تھے اور ثبوت کے ”ث“ کا کچھ علم نہ تھا۔

☆☆☆

بوجھل اور تھکے تھکے قدموں اور لٹکے ہوئے چہروں کے ساتھ ہم اور انسپکٹر شہباز تھانے میں داخل ہوئے۔ وہ خرانٹ وکیل کرسی پر بیٹھا پیپر ویٹ لٹو کی طرح گھما رہا تھا، اس کی نظریں اپنے بائیں ہاتھ پہ بندھی گھڑی پہ تھیں۔

”مل گیا ثبوت؟“ اس کی آواز طنز اور آنکھیں شرارت میں ڈوبی تھیں۔

”ہاں مل گیا! پیچھے آ رہا ہے!“ ہم جل گئے۔

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی نظریں اب بھی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔

”آخر آپ کو کس کا انتظار ہے؟“ ہم سے رہا نہ گیا۔

”ارے! ابھی تم ہی نے تو کہا تھا کہ ثبوت مل گیا۔ پیچھے آ رہا ہے۔ میں سمجھا کوئی

گواہ ہوگا، اسی کا انتظار کر رہا ہوں!'' وکیل نے حیرت سے کہا۔

''شاباش! تو آپ بات میں چھپے طنز کو بھی نہیں سمجھتے! اگر قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح میں بھی کوئی ڈپلومہ یا شارٹ کورس کر لیا ہوتا تو آج یوں وہ بنتے!''

''وہ کیا پتر؟'' انسپکٹر شہباز چونکے۔

''وہ ہ ہ ہ ہ!'' ہم نے ''وہ'' کو لہرایا۔

''کیا وہ ہ ہ ہ؟'' انسپکٹر شہباز جواباً خود جھومے۔

''وہی! بس آپ سمجھ جائیں! اب وکیل صاحب کو ان ہی کے منہ پر الو تو کہہ نہیں سکتا! وہ ہی سے کام چلا لیا ہے!''

''پھوہو ہوپ!'' انسپکٹر شہباز بری طرح ہنسے اور ان کے منہ سے ڈھیر سارا تھوک اڑ کر وکیل صاحب کے رخِ روشن پر جا گرا۔

''اس وقت تو تم لوگوں کے لیے یہی ایک کیس کافی سے بھی زیادہ ہے۔ ورنہ میں چاہوں تو تم لوگوں پر ہتک عزت کا دعویٰ کر سکتا ہوں لیکن اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ یہ ایک کیس ہی تم لوگوں کی چولیں ہلا دے گا!'' اس نے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے کن اکھیوں سے انسپکٹر شہباز کو دیکھا، ان کے چہرے پر کسی حد تک پریشانی چھلک آئی تھی اور وہ سوالیہ انداز میں ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم انہیں دلاسہ دینے کے لیے مسکرا دیے۔

☆☆☆

عدالت میں کچھ ایسا رش نہیں تھا۔ امی ابا جان اگلی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ امی کا منہ فق اور رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ منہ ہی منہ میں دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ ابا جان نے مکمل طور پر اپنے آپ کو پرسکون رکھا ہوا تھا لیکن آنکھیں ان کی پریشانی کی چغلی کھا رہی تھیں۔ سامنے کٹہرے میں باقی مجرم ڈھٹائی سے تنے کھڑے تھے اور ہمیں دیکھ دیکھ کر بے غیرتی

سے مسکرا رہے تھے جیسے خود باعزت بری ہو کر جائیں گے۔

جج صاحب کے تشریف لے آنے پر سماعت شروع ہو گئی۔

☆☆☆

''بھیم شاہ کی پراسرار اور غیر متوقع موت کے بعد میرے موکل کے پاس کوئی خاص یا ٹھوس ثبوت نہیں رہ گیا تھا سوائے اس کی کلینک میں موجود ٹرانسمیٹر کے جو ایک دم بے کار تھا ... جناب والا ... تب! میرے موکل نے ... ایک آخری چال چلی!'' وکیل ڈرامائی انداز میں بولا اور عدالت میں ''چال! آخری چال؟'' جیسی سرگوشیاں گونج اٹھیں۔

''آرڈر آرڈر!'' جج صاحب نے ہتھوڑا میز پر مارا۔

'' ... اور وہ آخری چال یہ تھی ... '' ہمارا وکیل کہتا چلا گیا۔ وہ بولتا جا رہا تھا اور ہمارے دشمنوں کے چہرے سیاہ پڑتے جا رہے تھے، ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ عدالت میں جتنے بھی لوگ موجود تھے ان کی دلچسپی عروج پر پہنچ گئی تھی ... امی ابا جان کے چہرے پر رونق آ گئی تھی اور طنزیہ اور فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے تھے ... انسپکٹر شہباز کو چونکہ یہ ''آخری چال'' معلوم تھی اس لیے ایک مسکراہٹ کے سوا ان کا ردِعمل اور کچھ نہ تھا۔ ہاں البتہ دشمن وکیل کی صورت دیکھنے والی تھی۔

کیس دشمنوں نے جتنا ہمارے خلاف اور پیچیدہ بنانا چاہا تھا۔ اللہ کی مہربانی سے کیس ہمارے لیے اتنا ہی آسان اور حق میں ثابت ہوا تھا ... خصوصاً پیش کیے گئے ثبوتوں نے تو ان کی امیدوں پر ساتوں سمندروں کا پانی پھیر دیا تھا۔

اللہ کی مدد سے ہم باعزت بری ہو کر مقدمہ جیت گئے اور دشمنوں کو وہ سزا ہوئی جس کے وہ حقدار تھے ... سزائے موت!

☆☆☆

اخباری رپورٹر کھچا کھچ ہماری تصویریں لے رہے تھے۔ کچھ ہم سے سوالات کرنے کے لیے بے چین تھے اور ٹی وی والے ہماری ویڈیو اس اشتیاق سے بنا رہے تھے

جیسے بچے قربانی۔ کے لیے لائی جانے والی موٹی تازی گائے کو دیکھتے ہیں، اور یہ سب دیکھ
کر ہماری گردن تھنے، پیٹ غرض ہر وہ چیز جو پھول سکتی تھی، فخر سے پھولی جا رہی تھی۔ اور
پر آخر فخر کیوں نہ ہوتا؟ ہم نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اس نے تمام ملک میں دھوم مچا دی
تھی۔ پھولے تو انسپکٹر شہباز بھی پڑ رہے ہوں گے لیکن کچھ ایسا نمایاں فرق ہمیں تو دکھائی
نہیں دے رہا تھا۔

اور ابھی تو ہمیں ایک پریس کانفرنس میں بھی جانا تھا!

☆☆☆

"یہ تمام چکر آخر شروع کیسے ہوا تھا ... کچھ تفصیلاً بتایئے۔"

سوال سن کر ہم نے ایک لمبا سانس بھرا اور پھر گویا ہوئے:

"کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے ہمارے گھر پر پراسرار گونگے فون جنہیں ہم
انگریزی میں "Dumb Calls" کہتے ہیں۔ آنا شروع ہوئے۔ فون اگر ہم
اٹھاتے تو دوسری طرف سے کوئی لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لینے لگتا۔ اگر ہمارے
علاوہ کوئی اور فرد اٹھاتا تو بناء کچھ کہے فون بند کر دیا جاتا۔ دوسری طرف CLI بھی ان
ٹیلی فونوں کا نمبر بتانے سے قاصر تھی۔ اس عجیب اور پراسرار صورت حال نے ہم سب کو
ذہنی طور پر پریشان بنا کر رکھ دیا۔ پھر ایک دن خبر ملی کہ کچھ پرانے عادی بردہ فروش جیل
سے فرار ہو گئے ہیں، یہ ہمارے پرانے دشمن تھے، دو بار پہلے بھی ہمیں اغوا کر چکے تھے اور
دونوں بار اللہ کے فضل سے ہم انہیں گرفتار کرانے میں کامیاب رہے، ایک دن ان
پرانے دشمنوں کی طرف سے فون پر ہمیں جان کی دھمکی ملی اور ہمارے والدین نے ہماری
احتیاط کے پیش نظر ہمیں ایبٹ آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ہم گھر سے ریلوے اسٹیشن کے لیے
روانہ ضرور ہوئے لیکن نہ ہی ریل میں بیٹھے اور نہ ہی ایبٹ آباد گئے بلکہ خفیہ طور پر ایک
چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کیا۔" ہم سانس لینے رکے۔

"گویا گھر سے بھاگ گئے؟" ایک رپورٹر نے بال کی کھال اتاری۔

"جی نہیں البتہ کچھ دنوں کے لیے گھر سے فرار ضرور حاصل کیا، اور آپ جانتے

ہی ہیں کہ اگر ہم ایبٹ آباد چلے جاتے تو مجرم شاید اتنی جلدی بے نقاب نہ ہو پاتے......
بہرحال ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ آخر مجرم کرنا کیا چاہتے ہیں کیونکہ جیل سے فرار وہ صرف
ہماری خاطر تو ہوئے نہیں ہوں گے، مجرم ہماری تاک میں تھے اور ہم ان کی اور دیگر عزیز
رشتہ داروں کی نظر سے بچنا چاہتے تھے۔ لہٰذا حلیہ بدلنے کا سستا طریقہ اپنایا اور اپنی
مونچھیں اور داڑھی منڈوالی اور آنکھوں کا چشمہ اتار کر بھورے رنگ کے کونٹیکٹ لینس
مستقلاً لگا لیے۔ اس طرح ہمارے حلیے میں خاصی تبدیلی آ گئی۔ اب ہم نے زوروں سے
مجرموں کی تلاش شروع کر دی لیکن ان کا سامنا تو نہیں ہو سکا۔ ہاں ایک دن ایک تنظیم
کے پمفلٹ......" ہم کہتے چلے گئے اور پھر تنظیم میں عمران بیگ کے فرضی نام سے رکنیت
وغیرہ سے لے کر سب بتا دیا۔ پھر بولے۔"...... بھیم شاہ کی جب ہم نے ذرا ٹھکائی
کی اور اسے ذرا یا دھمکایا تو وہ فرفر بول اٹھا، ہم ان کا منصوبہ سن کر طیش میں آگئے اور بھیم
شاہ کو بے ہوش کر دیا۔ پھر اس کے باقی ساتھیوں کو بھی بے ہوش کر کے کمرے میں بند کیا
اور پولیس کی مدد لینے تھانے آئے جہاں ہمیں اپنے پرانے مہربان انسپکٹر شہباز مل گئے۔"
ہم نے ان کی طرف اشارہ کیا اور وہ گردن کو حرکت دے کر مسکرا دیئے۔"ان کی مدد سے
بھیم شاہ اینڈ کمپنی کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہم اپنے گھر چلے آئے، لیکن کچھ ہی دیر بعد ہمیں
انسپکٹر شہباز کا ایٹم بم سے بھی زیادہ دھماکے دار فون ملا اور ہمارے ہاتھ پیروں کا تمام چڑیا
گھر رفو چکر ہو گیا، خبر تھی کہ بھیم شاہ حوالات میں دم توڑ گیا اس کے بعد ہمارے پاس
ابا جان کو اس تمام چکر سے آگاہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"تو گویا تب تک آپ کے والدین اس تمام چکر سے قطعی لاعلم تھے؟" اسی
رپورٹر نے دوبارہ بات اچکی۔

"جی ہاں...... ابا جان کو سن کر بجا طور پر بہت غصہ آیا، ہم تھانے گئے۔ وہاں
بھیم شاہ اینڈ کمپنی کا وکیل ٹکرا گیا جس کا کہنا تھا کہ بھیم شاہ ہمارے انتہائی تشدد کی تاب نہ
لاتے ہوئے گزر گیا ہے۔ اپنی بے گناہی کا ثبوت لانے کے لیے ہمارے پاس صرف 24
گھنٹے تھے، چنانچہ ہم وہ وائرلیس یا ٹرانسمیٹر لینے دوبارہ تنظیم کے دفتر گئے جس پر بھیم شاہ

اپنے ساتھیوں سے بات کر رہا تھا، لیکن پتا یہ چلا کہ وہ بالکل بے کار ناکارہ چیز ہے تو ہماری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اٹھے۔ اس وقت کسی بات پر انسپکٹر صاحب نے مایوسی سے کہا کہ "اب ماتم کرنے کا دل چاہتا ہے۔" تو لفظ "ماتم" سن کر ہمارے دماغ میں بجلی سی کوندی اور ہم نے کہا کہ "انکل، بھیم شاہ کا پوسٹ مارٹم تو ہوا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی موت اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں ہی ہوئی ہے کیونکہ بھیم شاہ کمزور آدمی تھا وہ ہماری ٹھکائی برداشت نہ کر سکا تو پولیس کی سختی پر بھی کیا کچھ نہ اگل دیتا۔"

یہ بات سن کر انکل بھی چونکے اور پھر ہم نے بھیم شاہ کے پوسٹ مارٹم کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد ہم تسنیم... "ہم کہتے چلے گئے۔ تمام رپورٹر بغور سن رہے تھے۔

"...... تسنیم سے کچھ خاص معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو ہم مایوس ہو گئے، ایسے میں انسپکٹر شہباز نے ایک شعر سنا کر ہمارا دل ہلکا کرنے کی کوشس کی، شعر سن کر ہم چونک اٹھے، کیونکہ شعر ہماری پسندیدہ غزل کا تھا اور وہ غزل ہم انٹرنیٹ پر Chatting کرتے ہوئے شاعری کے چینل پر اکثر سنایا کرتے تھے۔ ہمیں فوراً ہی خیال آیا کہ ہو نہ ہو بھیم شاہ بھی یقیناً کسی کمپیوٹر پر Voice Chat ہی کر رہا ہوگا۔ یہ سوچ کر ہم نے ایک بار پھر تنظیم کے دفتر کا رخ کیا۔ وہاں بھیم شاہ کی Clinic میں رکھی الماری کے ایک پوشیدہ خانے سے ایک Laptop کمپیوٹر برآمد ہوا جس کی "History" میں Chatting Sessions میں ایک سیشن محفوظ تھا اور وہ اسی وقت کا تھا جب ہم نے بھیم شاہ کو Clinic میں سے بولتے سنا تھا۔ Laptop قبضہ میں لے کر ہم نے ایک بار پھر پورے دفتر کا جائزہ لیا کہ شاید کوئی اور ثبوت بھی ہاتھ لگ جائے۔ ایک کمرے سے گزرتے ہوئے ہماری نظر ایک خوبصورت پینٹنگ پر پڑی جس میں ایک صحت مند گھوڑے کو دوڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ تصویر ہمیں خاصی اچھی لگی اور ہم نے بے اختیار ہو کر اس گھوڑے پر ہاتھ پھیرا کہ محسوس ہوا گھوڑے کی آنکھ پر انگلی لگنے سے آنکھ کچھ اندر کو دبی ہے، ہم نے پھر بے سوچے سمجھے آنکھ پوری دبا دی اور تصویر فوراً ہی دوسری طرف کو کھسک گئی اور تصویر کے پیچھے ایک خفیہ راستہ برآمد ہوا جو کہ ایک طویل و عریض ہال کو

جاتا تھا اور ہال زرد کاغذ پر چھپے انتہائی خطرناک مواد سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ چند دوسری دستاویزات بھی ملیں، ان تمام اشیاء کے بعد کسی قسم کے دوسرے ثبوتوں کی ضرورت ہرگز نہیں تھی، تنظیم کا دفتر پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا اور تسنیم کے بتائے گئے دوسرے شہروں میں قائم مراکز اب تک ملٹری آپریشن کے ذریعے قبضے میں کر لیے گئے ہوں گے۔ بہرحال کچھ دوسرے ضروری اقدامات کرنے کے بعد ہم تھانے لوٹے اور وکیل پر ظاہر کیا کہ ہمارے ہاتھ کوئی ثبوت نہیں لگ سکا، کیوں کہ اگر ہم بھانڈا پھوڑ دیتے تو مجرموں کے ساتھی وہ ثبوت حاصل کر کے ضائع کرنے کی کوشش ضرور کرتے، بہرحال! جب عدالت میں ہماری جانب سے ثبوت کے طور پر بھیم شاہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ جس میں صاف لکھا تھا کہ اس کی موت بدن پر لگی چوٹوں کے باعث نہیں بلکہ گلا گھونٹنے سے ہوئی ہے اور اس کا گلا پوسٹ مارٹم سے تقریباً پانچ گھنٹے پہلے گھونٹا گیا جس وقت وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حوالات میں بند تھا اور ہم نے جو اسے چوٹیں لگائیں تھیں وہ قریب قریب سات گھنٹے پہلے کی تھیں۔ اس کے علاوہ خفیہ ہال کی ویڈیو فلم جو رات ہی رات بنوائی گئی اور جس میں زرد کاغذ پر چھپا مواد اور وہ دستاویزات بھی واضح دکھائی گئیں اور پھر اصل دستاویزات اور وہ مواد کا کچھ نمونہ مجرموں کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے لیے کافی سے بھی زیادہ ثابت ہوا!" ہم تفصیلاً کہتے چلے گئے۔

"لیکن یہ آخر چکر تھا کیا آپ نے واضح نہیں کیا۔ اور وہ دستاویزات و مواد وغیرہ۔" ایک رپورٹر نے بال پوائنٹ کا سرا منہ میں پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"چکر تو مجرموں کو سزا ہونے کے بعد سے ہی شہر میں مشہور ہے۔ تاہم اگر آپ میرے منہ سے سننا چاہتے ہیں تو سنئے۔ یہ چکر دراصل ایک اغوا کا چکر تھا، ایک پراسرار اور انوکھے اغوا کا جس کی شاید عرصے تک کسی کو خبر تک نہ ہو پاتی کیونکہ یہ اغوا جسم کا نہیں، خیالات کا اغوا تھا۔ ہمارے وطن کی نوعمر نسل کے خیالات کا اغوا جسے آگے چل کر ملک کو ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ ہمارے وطن کے خلاف دشمن ممالک کی انتہائی گھناؤنی چال، نئی نسل کو ملک سے بدظن کرنے کی سازش۔ جب سے ہمارے وطن نے

"آپ کو خوشی یقیناً ہوئی ہوگی کہ اکیلے اتنا بڑا کارنامہ......"

"نہیں اکیلے کہاں!" ہم نے جلدی سے کہا۔ "اس معاملے میں انسپکٹر شہباز صاحب نے ہمارا بڑا ساتھ دیا ہے اور ہماری بڑی مدد کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ انہیں اور ان کا تعاون دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ واقعی پولیس میں ابھی کچھ بات ہے! ہاں البتہ ایک ذاتی تجربہ جو حاصل ہوا کہ کبھی بھی کوئی قدم بھی ماں باپ کی مرضی کے بغیر اٹھانا نہیں چاہیے، ہم نے تمام کام والدین سے چھپا کر کیا اور آخر میں پریشانی بھیم شاہ کے قتل کے الزام کی صورت میں گلے پڑ گئی۔" ہم بولے اور ٹھیک اسی وقت ایک زوردار دھماکہ ہوا۔

☆☆☆

سب ہڑبڑا گئے۔

"معافی چاہتا ہوں، میری فائل گر گئی تھی۔" ایک رپورٹر نے نیچے جھکتے ہوئے کہا اور سب نے سکون کا سانس لیا۔ اسی کے ساتھ کانفرنس ختم ہوگئی۔

☆☆☆

اگلے دن اخبارات میں ہمارے باتصویر بیان شائع ہوئے تھے اور ہم پھولے نہیں سما رہے تھے، سب سے خوشی کی بات یہ تھی کہ حکومت نے ہمارے کارنامے پر ہمیں اور انسپکٹر شہباز کو ہمارا تعاون کرنے پر ایک خطیر رقم انعام میں دینے کا اعلان کیا تھا۔

ابھی ہم انعام کی رقم خرچ کرنے کے منصوبے بنا ہی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی اور ہم نے لپک کر فون اٹھایا۔

"ہیلو!"

جواباً دوسری طرف سے پھر گہرے گہرے سانس گونجنے لگے۔

☆☆☆

"ہا ہا...... ہیلو......" ہم پریشان ہوگئے۔

"اوئے ہا ہا ہا ہا! ڈر گیا میرا شیر میرا پتر!" دوسری طرف سے انسپکٹر شہباز کا

"باوزن قہقہہ" گونجا تو ہماری جان میں جان آئی۔

"توبہ ہے انکل آپ نے تو...... ڈرا ہی دیا تھا!"

"بس اوئے میں سوچا تھوڑا مخول ہی کرلوں...... پترتوں نے اخبار دیکھا آج کا؟"

"جی...... اور میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا کہ انعام کی رقم کیسے خرچ کروں!"

"اچھا! کیا سوچیا پھر توں نے؟"

"سب سے پہلے تو حج ایبٹ آباد جاؤں گا!" ہم ہنسے۔

"اوئے منیا...... میرے پاس ایک آئیڈیا ہے! پلس کی نوکری تو میں اب چھوڑ رہا ہوں...... یہ جو ہم چچا بھتیجوں کو انعام میں رقم ملی ہے اس سے کیوں نہ کوئی بڑھیا سا بجنس شروع کریں گے۔"

"ہممم! مثلاً؟" ہم نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"مثلاً...... اوکوئی مویشی فارم خرید لیتے ہیں شراکت داری میں...... کیٹل فارم! گائیں، بھینیں، دودھ تے مکھن تے وارے ای نیارے!"

"آئیڈیا تو آپ کا اچھا ہے لیکن وہ کیا ہے کہ بھینسوں میں میری دلچسپی نہیں ہے!"

"او تو فکر نہ کر میں بھینسوں کو بیوٹی پارلر سے تیار کرواؤں گا تیری دلچسپی پیدا ہو جائے گی! ابے منے سوچ لے، تازہ تازہ خالص دودھ تے خالص مکھن! صاف ستھری ہوا! تیری شادی ہو جائے گی تو بیوی بچوں کے ساتھ چھٹیاں منانے آنا!" انہوں نے مخلصانہ پیش کش کی۔

"اچھا! پھر بھی...... میں......" ہم سوچ میں پڑ گئے۔

"یار میں سو دو سو مرغیاں بھی پال لوں گا ان کے انڈے بیچ بلچ کر کھائیں گے اور پھر جب ان کے بچے ہوں گے تو ان کے انڈے کھائیں گے، دیسی مرغیاں ہوں گی۔ دیسی!" انہوں نے پھر للچایا۔

آزادی حاصل کی ہے تب ہی سے دشمن ممالک میں کھلبلی مچی ہے، اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک نے پہلے ہی دن سے دشمنوں کے لیے خطرے کا بگل بجا دیا ہے اور دشمن شروع دن ہی سے ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلا کرنے کی دیوانگی میں مبتلا ہے۔ ہمارے دشمن ہمارے خلاف کئی چالیں چل چکے ہیں لیکن یہ چال ان سے کہیں زیادہ مہلک ہو سکتی تھی، ہمارے دشمنوں نے ہمارے ملک کو کمزور کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا وہ یہ تھا کہ نئی نسل کو ملک سے اس حد تک بدظن کر دیا جائے کہ وہ اس ملک سے شدید نفرت کرنے لگے۔ اس مقصد کے لیے ملک کے اندرونی حالات کا سہارا لیا گیا۔ فرقہ واریت اور دہشت گردی جو کہ دشمنوں ہی نے شروع کروائی ہوئی ہے، کے حوالے دے کر نوجوانوں کو ایک تنظیم میں شامل کر لیا گیا۔ جہاں ''شعوری کلاسز'' کے نام پر ملک کے خلاف غیر شعوری باتیں اس پیرائے سے کی جاتیں کہ غیر محسوس طور پر نوجوانوں کے اندر ہی اندر ملک کے خلاف نفرت کا عجب لاوہ پکتا گیا، یہ ایک طرح کی سلو پوائزنگ ہی تھی جس سے نوجوان بدظن ہوتے جا رہے تھے، مجرموں نے سوچا تھا کہ وہ نئی نسل کو بدظن کر کے ملک کو کمزور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، کیونکہ پڑھے لکھے نوجوانوں میں بیرون ملک جانے کا رجحان ویسے ہی بڑھ گیا ہے۔ رہی سہی عوام کو یہ اپنے ساتھ ملا لیتے، لگے ہاتھوں انہوں نے دفاعی ٹریننگ کے نام سے نوجوانوں کو دہشت گردی کی باقاعدہ ٹریننگ دینا شروع کر دی کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو دہشت گرد بنا کر ان کے ہی ملک کے خلاف استعمال کیا جائے تاکہ اگر کبھی دہشت گرد مارے بھی جائیں تو بھی نقصان ہمارے ہی ملک کا ہو، اس گھناؤنے مقصد کے لیے ملک کے تمام صوبائی دارالحکومتوں میں دفاتر قائم کر لیے گئے تھے جو اب اللہ کی مہربانی سے بند کروا دیئے گئے ہیں اور وہ تحریری مواد اور خفیہ ہال سے برآمد ہوا تھا۔ ضبط کر کے نذر آتش کر دیا گیا۔ وہ ملک کے خلاف نفرت انگیز تحریروں، فرقہ وارانہ وصوبائی تعصب سے بھرپور مواد تھا جو چوری چھپے عوام میں پھیلایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ دستاویزات بھی قبضے میں کر لی گئی ہیں۔ ان میں اس تمام سازش کی تفصیل درج ہے۔ اصل میں اس کچھ کوتاہیاں ہماری بھی ہیں۔ ہمارا میڈیا

بالخصوص الیکٹرانک میڈیا لوگوں میں حب الوطنی پیدا کرنے اور مثبت انداز فکر اجاگر نہیں کر پا رہا نہ ہی عوام کو ہماری تفریح فراہم کی جا رہی ہے۔ اسی طرح پرنٹ میڈیا بالخصوص اخبارات، آپ سب صحافی حضرات یہاں بیٹھے ہیں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ کچھ اخبارات کا کام بلاوجہ کی سنسنی و دہشت پھیلانے کے سوا کچھ نہیں، بات ہوتی سوئی جتنی ہے لفظوں کے ساتھ کھیل کر اسے کھمبے جتنا بنا دیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سچائی چھپائی جائے لیکن سچائی کو حکمت سے سامنے لانا چاہیے۔ اس پر جھوٹ کا ملمع چڑھا کر نہیں، اکثر اخبارات اپنا اخبار بیچنے کے لیے مرچ مسالا لگا کر خبر پیش کر دیتے ہیں، اب ان کا اخبار تو بک جاتا ہے لیکن عوام میں جو ہراس پھیلتا ہے وہ؟ اسکولوں میں پڑھایا جانے والا نصاب دیکھ لیں، ہمارے ملکی و مذہبی ہیروز کے اسباق آٹے میں نمک کے برابر شامل کیے جاتے ہیں۔ ان حالات میں نئی نسل کو الہام تو نہیں ہوگا کہ کس ہیرو نے کیا کارنامہ انجام دیا اور پھر نئی نسل کی تفریح ٹی وی، میوزک، ویڈیو گیمز اور کمپیوٹر تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور وہ اچھی کتابوں اور اچھے ادب سے دور ہوتی جا رہی ہے جس کے ذمے دار صرف بڑے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے اندرونی حالات جیسے فرقہ واریت، دشمن تو موقعے کی تاک میں رہتا ہے۔ ہم خود آپس میں لڑ جھگڑ کر اسے موقع فراہم کر رہے ہیں کہ ''آ بیل مجھے مار'' اور بیل ''جی آیا نوں'' کہہ کر سینگ جھکائے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیل کو دھوکا دینے کے لیے ہمارے ہاتھ میں سرخ کپڑا ہے بھی کہ نہیں یا خود کو کھانے کے لیے سرخ لباس پہنے کھڑے ہیں! اور پھر بے روزگاری جیسے مسائل کس ترقی پذیر ملک کے نہیں ہوتے؟ بہرحال میں نہ تو ملکی حالات پر تقریر کروں گا نہ مذہبی تبلیغ کرنے بیٹھا ہوں۔ یوں بھی بات لمبی ہوتی جا رہی ہے ہاں صرف ایک بات کہوں گا کہ ہمارے قائد نے پہلے بھی ایک بار کہا تھا اور آج میں دہراتا ہوں کہ ہمارا ملک قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے تباہ نہیں کر سکتی۔ یہ بات دشمن گرہ میں باندھ لیں کہ اللہ قدم قدم پر ہمارے ملک کی حفاظت کر رہا ہے، جب بھی دشمنوں نے کوئی چال چلی منہ کی کھائی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی منہ کی کھاتے رہیں گے!''